

لہجۂ راز

راز زیدی

لہجۂ راز

راز زیدی

عظمیٰ پبلشر
ایس ڈی ۳۲ - اے بلاک
نارتھ ناظم آباد - کراچی

مہتممِ اعلیٰ : سید ادیب حسین

ترتیب و تدوین : سید جاوید حسین

پہلا ایڈیشن : جنوری ۱۹۸۵ء

تعداد : گیارہ سو

مطبع : جدید کتابت

خوشنویس : عبدالرحمٰن

قیمت : [redacted] روپے

ملنے کا پتہ :
جاوید منزل۔ ایل ۴۵۲ سیکٹر ۲/سی۔ ۵
بفرزون نارتھ کراچی۔ فون: ۶۵۰۲۹۵

اِنتسَابُ

اپنی پیاری بیٹی کے نَام
جو میرے دِل کی
دھڑکنوں میں
موجُود ہے

نمودِ تجسیمِ تاریخ

۱۴۰۵ھ

ہے تشریحِ بیاضِ رازؔ زیدی

۱۹۸۵

ادا ہے علم و فن سے جس کا آغاز

۱۴۰۵

جو مہ ہر مصرعِ تاریخ میں ہے

۱۹۸۵

فدا ہے انتخابِ لہجۂ رازؔ

۱۴۰۵

اسمٰعیل انیس

فہرست

حمد

تیرا خیال ہی اس ناتواں کو کافی ہے
کرم جو تو نے کیا ہے وہ سب اضافی ہے

میں ایک بندۂ ناچیز ہوں مگر پھر بھی
تجھے خیال ہمیشہ رہا مرا پھر بھی

ترے سوا نہ کسی پر نظر گئی اپنی
یہی سبب ہے کہ اچھی گذر گئی اپنی

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نعت

نہیں معلوم تھا انساں کو خود کیا ہے خدا کیا ہے
خدا سے اسکے بندوں کا مسلسل رابطہ تم ہو

عمل جاری رہے گا تا ابد جس پر زمانے میں
کتاب زندگی کا وہ مکمل ضابطہ تم ہو

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
صدر شعبہ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی

پیش لفظ

غزل پر کیسے کیسے وقت پڑے۔ کبھی نظم کے دھارے نے اِس کے سفینہ کو منجدھار میں ڈال دیا۔ کبھی شاعری کے نام پر نثری شاعری نے اس کے منصب کو کم کرنے کی کوشش کی مگر یہ اس کی سخت جانی کہیئے یا اِس کی قوت کہ ہر دھارے کو غزل کے سامنے اپنا رُخ بدلنا پڑا۔
ہر دور میں شاعری کی ابتداء کرنے والا غزل سے آغاز کرتا ہے اور جب وہ شاعری کی انتہا پر پہونچتا ہے تو غزل کہتا ہے۔ اچھی غزل کی پہچان یہ ہے کہ اُس نے ہر زمانے کی صالح روایات کو اپنایا ہے۔ قدیم روایات کے ساتھ جدید ذہن سے ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اِس رمز کو پہچان لیا اُن میں رازؔ زیدی کا بھی ایک نام ہے۔

رازؔ زیدی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جنہوں نے غزل کے نئے مطالبات کو بھی سمجھا ہے اور قدیم روایات کو بھی اپنایا ہے۔ جدید مطالبات سے میری مُراد جدید تجربوں سے نہیں ہے بلکہ عہد حاضر کے موضوعات سے ہے۔ رازؔ گوشہ نشین شاعر ہیں اُنہوں نے اپنی شاعری کو کبھی پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ سادہ اور سلیس انداز میں رازؔ نے اپنے جذباتِ دل کا اظہار کیا ہے ؎

سوچا کبھی مرنے کے لئے میں نے، تو یہ دل
انکار بھی کرتا رہا، آہستہ سے ہاں بھی

کبھی عزیز تھے ہم جن کو زندگی کی طرح
گزر گئے وہ برابر سے اجنبی کی طرح

سایۂ زُلف ہم سے دور سہی
اِک حسین شہر میں قیام تو ہے

بس اس خیال سے اقرارِ جُرم ہے مجھ کو
کہ چُپ رہا تو یہ الزام تجھ پہ آئے گا

میں نے اوپر کی سطور میں عہدِ حاضر کی ترجمانی کا ذکر کیا ہے۔ رازؔ نے اپنے عہد کے کرب کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ اُن کی دھڑکن عہدِ حاضر کی دھڑکن کے ساتھ مل گئی ہے۔

ایک عالم ہے کہ تاریک ہُوا جاتا ہے
روشنی ہے کہ نکلتی نہیں ایوانوں سے

دھوپ ہی دھوپ ہے اس دشت میں سایہ نہ درخت
ہم یہ سمجھے تھے گزر جائیں گے سائے سائے

سفر میں دھوپ کی شدت انہی کو ہے معلوم
جو لوگ چل کے خزاں سے بہار تک پہونچے

دھوپ، سایہ، دیوار، درخت، خزاں، بہار یہ سب علامتیں ہمارے موجودہ مسائل کا سوالیہ نشان ہیں۔ رازؔ صاحب نے اِن علامتوں کو بڑی خوبی سے دورِ حاضر کے مسائل سے ہم آہنگ کر دیا ہے مگر اِن نامساعد حالات میں بھی شاعر اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔

ہر نئی راہ میں دیوار کھڑی ہے لیکن
دیکھتے ہیں کسی دیوار میں در ہو شاید

شگفتہ پھولوں سے تو سب نے پیار کیا ہے مگر مُرجھائے ہوتے پھولوں سے پیار کرنا جرأتِ رندانہ کا کام ہے۔

شاخ پر رہ گئے جو مُرجھا کر
آؤ ایسے گُلوں سے پیار کریں

رازؔ صاحب کی شاعری کا ایک اہم پہلو اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ اپنی اخلاقی تعلیم میں شعریت کو فنا نہیں ہونے دیتے۔ شاعرانہ حیثیت سے اِن اشعار کو خواہ ان کے دوسرے اشعار کے مقابلہ میں نہ رکھ سکیں لیکن ان کے مزاجِ شعری میں اُن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

جو آئیں راہ میں پتھر اُنہیں ہٹاتے چلو
بچو گے تم تو کوئی اور چوٹ کھائے گا

ہوائے نفرت و اغراض اتنی تیز نہ ہو
کہ لَو چراغِ محبت کی تھرتھرانے لگے

جانے والوں سے یہ کہہ کر سنبھل کر جانا
راہ کو اور بھی دشوار بناتے کیوں ہو

اس وقت میرے سامنے رازؔ زیدی صاحب کا مختصر انتخاب ہے۔ اِس انتخاب کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جب اُن کا دیوان شائع ہو کر سامنے آئے گا تو اہلِ نظر ضرور اُن کے فن کی داد دیں گے۔ خود شاعر کا تو اپنے بارے میں یہ خیال ہے

مُردہ ہوں کہ ہر سمت سے لاشوں میں گھِرا ہوں
زندہ ہوں کہ زندہ مرا احساسِ طرب ہے

ظہیر احمد صدیقی

پیغام

راز زیدی صاحب کراچی پورٹ ٹرسٹ سے تقریباً ۲۸ سال منسلک رہے۔ دورانِ ملازمت انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی بطریقِ احسن انجام دیتے اس کے ساتھ ساتھ پورٹ ٹرسٹ کی بزمِ ادب اور سہ ماہی "صدف" کے ذریعے شعروادب کی بھی آبیاری کرتے رہے۔

راز صاحب بے حد سادہ اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک ہیں۔ شعرگوئی میں اپنا مقام رکھنے کے باوجود شہرت اور مشاعروں کی بھیڑ بھاڑ سے ہمیشہ دور رہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ نے رضاکارانہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خود کو شعروادب سے وابستہ رکھا ہے جو آپ کی افتادِ طبع اور زندہ دلی کی علامت ہے۔

زیرِ نظر راز زیدی کا مجموعہ کلام اپنے لہجہ اور تنوع کے اعتبار سے بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ راز زیدی کا لہجہ اشعار کے قالب میں یوں ڈھلتا چلا جاتا ہے کہ قاری کو اس میں اپنے لہجے کی بوباس اور مٹھاس کا احساس ہوتا ہے۔

راز صاحب کا کلام وارداتِ قلبی اور گردشِ شام و سحر کے دامن میں کہیں کہیں دودِ چراغِ محفل کا سماں بھی پیش کرتا ہے جو ایک اچھے غزل گو شاعر کی پہچان بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعری جتنی حقیقت سے قریب ہوتی ہے اُتنی ہی پُرتاثیر ہوتی ہے اور یہی راز زیدی کی شاعری کا وصف اور کمال ہے کہ اس میں ہر کسی کو اپنا عکس محسوس ہوتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ اُس نے جو کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں راز زیدی صاحب کو اُن کے دیوان کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے دُعاگو ہوں کہ وہ شاد و کامراں زندگی گزاریں اور اُن کے کلام کی خوشبو فضاؤں میں بکھرتی رہے۔

ارشد

ریئر ایڈمرل محمد اسحاق ارشد
(ہلالِ امتیاز۔ ستارہ بسالت)
چیئرمین کراچی پورٹ ٹرسٹ

لہجۂ رازؔ

رئیس امروہوی

اِنسانی رُوح کا پیچ و تاب اُپنے اِظہار کے لئے جو ذرائع اختیار کرتا ہے۔ اُن میں سب سے زیادہ مُوثر، سحر انگیز اور حیران کُن وسیلہ فنونِ لطیفہ کا ہے اور فنونِ لطیفہ میں بھی شعر جس استعاراتی اور ابلاغی حُسن کے ساتھ وجدان کے سوز و ساز کی تفسیر و ترسیل کرتا ہے اُس کی وضاحت الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں۔ لفظ ٹھیک ٹھیک اِس کیفیت کا اِظہار کرنے سے قاصِر ہے۔ جو روحِ شعور اور روحِ شاعر پر گُزرتی ہے۔ رآز زیدی کے ایک شعر کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں ؎

ہر نئی رَاہ میں دیوار کھڑی ہے لیکن
دیکھتے ہیں کسی دیوار میں دَر ہو شاید

یہاں اس شعر میں دیوار اور دَر جس وسیع جذباتی جزر و مَد اور باطنی تلاطم کا ابلاغ کرتے ہیں۔ اس کی مثال نہ موسیقی پیش کر سکتی ہے نہ مُصوری! سچی بات یہ ہے کہ شعر کو سُن کر جو تاثر پیدا ہوتا ہے اُس کی اِتنی سمتیں اور اتنے پہلو ہیں کہ ہم اُنہیں محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس طرح بیان نہیں کر سکتے جس طرح بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر نئی رَاہ میں ایک دیوار کا حائل ہو جانا اِنسانی زندگی کی ایک بدلتی حقیقت ہے جب ذہن یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ مُشکلات کی چہار دیواری میں محبوس ہے تو انسان اپنی فطرت کے بموجب 'دیکھتے ہیں کسی دیوار میں دَر ہو شاید' کہہ کر اپنی تسکین کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ اِس قسم کے نازک اشعار بہت وسیع المعانی ہوتے ہیں اور اُن کا تعلق شعُو

کے طرزِ احساس کہ وہ زندگی کے نَو بہ نَو حقائق کو کس کس طرح محسوس کرتا ہے سے ہوتا ہے۔ رازؔ زیدی کے کلام کی وَاضح خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے محسوسات کو ایسے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ سُننے وَالے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کے کسی نئے پہلو سے دوچار ہو گیا۔ یا یوں کہوں کہ اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کا خیال تو کبھی نہ کبھی اُسے بھی آیا تھا لیکن وہ اپنے خیال کو مُناسب الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر رہا۔ یعنی لاشعور میں اک دھواں سا اُٹھا اور شعور کی سطح پر آ کر تحلیل ہو گیا۔

کبھی جینے کو تھی فن کی ضرورت
مگر اس دور میں جینا بھی فن ہے

اس دور میں جینا بھی فن ہے۔ ایک ایسی صَداقت ہے جس کا تجربہ ہر شخص بجائے خود کرتا ہے۔ اُس کی کم مائیگی یہ ہے کہ وہ اس صداقت کا اظہار اس طرح نہیں کر سکتا جس طرح چند الفاظ میں رازؔ نے کر دیا ہے

تعبیر جسے کرتے ہیں ہم جہد و عَمل سے
کہتے ہیں اُسے عشق بھی کچھ رد و بدَل سے

یہ ایک اور نُکتۂ رازؔ ہے۔ عِشق کو بعض اوقات بے عملی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "زیا کام محبّت سے اس آرام طلب کو۔ میر تقی میرؔ) لیکن عشق آرام طلبی نہیں یہ ایک مُسلسل جہد و عمل ہے۔ البتّہ اس کی شکل بدَل جاتی ہے۔ رازؔ نے عجیب برجستگی اور دلپذیری کے سَاتھ اس نکتے کو بیان کیا ہے۔

مجھے خیال نہیں آتا کہ آج سے پہلے رازؔ زیدی کے کلام کے مُطالعے اور اُن کی فکر سے آشنائی کا موقع مِلا ہو۔ یہ وَاقعی میری محرومی تھی۔ رازؔ زیدی کے منتخب اشعار دیکھ کر اندازہ ہُوا کہ یہ تو دُنیا ہی اور ہے۔ ہر عہد میں غزل کا ایک انداز رہا ہے اور اس انداز کا تعلق متعلقہ عہد کی جذباتی اور احساساتی رَو سے ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔

ہم ایک انتہائی متلاطم باطنی کیفیت کے دور سے گزُر رہے ہیں اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارے بعض غزل گو شعرا اس روحانی ہیجان کی ترجمانی بڑی قادر البیانی اور

نادرالبیانی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ میں رازؔ کا شمار انہیں غزل گو شعرا میں کرتا ہوں۔ بے سمتی، منزل ناشناس، مقصود سے ناآگہی، نصب العینِ حیات کا فقدان، تنہائی کی طلب، ہجوم کا خوف، نامعلوم مستقبل کے اندیشے اور تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی دنیا کی نیرنگیاں! ایسے روحانی مسائل ہیں جنہوں نے عہدِ حاضر کو عہدِ تلاطم آشوب میں بدل دیا ہے۔

رازؔ کی روح پر یہ تمام داخلی وخارجی کیفیات گزرتی ہیں اور وہ انہیں زبان بخش دیتے ہیں ؎

جب ٹوٹ گئے پائے طلب راہِ طلب میں
تب جا کے کہیں سمت کا اندازہ ہوا ہے

راہِ طلب میں پائے طلب کا ٹوٹ جانا اور پھر سمتِ سفر کا اندازہ ہونا۔ ایک ایسی واردات ہے۔ جس کو فکر کی مدد سے نہیں۔ احساسِ ۔ بے پایاں اور ہمہ رنگ وجدان کے توسط سے سمجھا جا سکتا ہے۔

میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رازؔ زیدی کا لہجہ پُر از ہیجان مگر معنی آفریں اور خیال انگیز شخصیت کا مکمل آئینہ دار ہے اور اس اعتبار سے وہ ہمارے اُن غزل گو شعرا میں شامل ہیں جن کو نہ حال نظر انداز کر سکتا ہے نہ مستقبل۔

رئیس امروہوی

رازؔ کی غزل

جذبات کو زبان دینا اور احساسات کی منظر کشی کرنا شاعری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کو زبان دینے والا اظہار و بیان کا کونسا سانچہ استعمال کرتا ہے اور احساسات کی منظر کشی کے لئے حرف و صوت کے کون کون سے رنگ استعمال ہوتے ہیں۔ وہی شاعر بڑا ہے جو مخصوص تجربات کو اپنے احساس کی گرفت میں لے کر انہیں بیان بھی اس طرح کرے کہ جس طرح اس نے خود تجربہ کیا ہے اور یہی چیز شاعری کو اثر پذیری سے مالا مال کرتی ہے۔

انسان نے سب سے پہلے اپنی ذات سے عشق کیا ہے اسی عشقِ ذات کے سبب تو جہاں جہاں نظر آتے ہیں انسان اپنی محبت کی پناہ گاہیں تعمیر کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنی محبتوں کو پوری کائنات تک وسعت دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنا دیتا ہے۔

رازؔ زیدی شاعری کے ذہنِ جدید کے مالک ہیں اور وہ بھی اپنی ذات کے حوالے سے پوری کائنات کو دیکھتے ہیں اس لئے ان کی شاعری کا جائزہ بھی اسی تناظر میں لینا چاہیے۔ آیئے ان کے کچھ شعر پڑھیں ؎

کرتے ہو اگر ظلم کسی پر تو یہ سوچو
پاؤ گے کہاں جا کے اماں ردِ عمل سے

دھوپ ہی دھوپ ہے اس دشت میں سایہ نہ درخت
ہم یہ سمجھے تھے گذر جائیں گے سائے سائے

جب ٹوٹ گئے ہم پائے طلب راہِ طلب میں
تب جا کے کہیں سمت کا اندازہ ہوا ہے

تراش دی ہے رہِ زیست اس طرح ہم نے
کہ رنج و غم بھی گزرتے رہیں خوشی کی طرح

ایک لمحہ بھی سفر کا نہ گنوایا میں نے
دھوپ سے بچنے کو ڈھونڈا نہیں سایہ میں نے

دی نہ حالات نے دم لینے کی مہلت پھر بھی
زندگی تجھ سے بہت لطف اٹھایا میں نے

اسی خیال سے اقرارِ جرم ہے مجھ کو
کہ چپ رہا تو یہ الزام تجھ پہ آئے گا

جانے والوں سے یہ کہہ کر کہ سنبھل کر جانا
راہ کو اور بھی دشوار بناتے کیوں ہو

جو آئیں راہ میں پتھر انہیں ہٹاتے چلو
بچو گے تم تو کوئی اور چوٹ کھائے گا

ان شعروں میں رازؔ زیدی نے زندگی کے مختلف تجربات کی نہایت چابکدستی سے عکاسی کی ہے، دوسروں کے غموں کو یا یوں کہیئے اپنے غموں کو جو آفاقیت بخشی ہے وہ نہایت موثر ہے، اور یہی انفرادی جذبہ پوری انسانیت کی اکائی بن کر فکر و ذہن کو ایسی آسودگی بخشتا ہے جو ہمارے بہت سے انفرادی اور اجتماعی دکھوں کا مداوا ہے۔

راز زیدی کی شاعری میں یہی جذبہ اور تمام جذبوں سے نمایاں ہے اور اسی سے ان کی انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔

مادّی دُنیا کی تیز رفتار زندگی نے ہر شخص کو اپنی ذات میں نا آسودہ کر دیا ہے اور ہر شخص ایک اعصابی کرب میں مبتلا ہے اس دور کا انسان نہ فلسفے سے آسودہ ہے نہ تصوّف سے اور نہ سائنس سے۔ فلسفہ نے اُسے نفسیاتی بیمار بنا دیا ہے تصوّف کی افیون سے وہ کاہل اور بزدل ہو گیا ہے اور سائنس نے اسے ہر دوسرے انسان سے خوفزدہ کر دیا ہے اور مذہب جو تمام دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے اس کا بھرم سائنس کی ایجادات نے دُھندلا دیا اور مذہب کے ساتھ بھی سلوک فلسفہ کی موشگافیوں نے کیا غرض اس دور کا انسان ایسے کرب میں مبتلا ہے جس کا علاج کوئی تریاق نہیں۔ راز زیدی بھی حسّاس دل رکھتے ہیں وہ بھی یہ کرب محسوس کرتے ہیں بلکہ انہیں یہ کرب ہمہ جہت نظر آتا ہے اور وہ اس کا اظہار برملا اور بڑی سچائی سے کرتے ہیں ؎

زیست اک خوف ہے جس سے میں لرزتا ہی رہا
موت پیغامِ سکوں ہے وہ کبھی آ جاتے

نظامِ عالمِ ہستی بدل گیا ہوتا جو ساتھ ساتھ غموں کے خوشی نہیں ہوتی

یہاں کچھ کوہکن بھی ہیں تو کیا ہے بہت ہیں راہ میں سنگِ گراں بھی

اک سجدہ کی خواہش ہے وہ پا جائے گی تکمیل
کعبہ کا ہے در بند تو میخانہ کھلا ہے

کبھی عزیز تھے ہم جن کو زندگی کی طرح
گزر گئے وہ برابر سے اجنبی کی طرح

ہم تو سب کو اچھا سمجھے جانے لوگ ہیں کیا سمجھے
آتی دہشت تھی طوفاں کی ساحل کو بھی دریا سمجھے

ان اشعار میں دل گداختگی کے ساتھ ساتھ آپ کو زندگی کے بھرپور تجربے محسوس ہوئے ہوں گے اور یہی راز زیدی کے کلام کی خصوصیت ہے وہ مضمون آفرینی کے لئے گداز اور سوز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کی شاعری میں بڑی اور اچھی شاعری کے تمام عناصر جستہ جستہ پائے جاتے ہیں اور یہ فی زمانہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

تابش دہلوی

ایک مُفکّر شاعِر

حضرتِ رازؔ زیدی کی غزلیں لہجۂ رازؔ کے نام سے منظرِ شہود پر آ رہی ہیں۔ یہ امر اہلِ فکر و نظر کے لئے باعثِ مسرت ہے۔ میں نے لہجۂ رازؔ کا مسودہ بنظرِ غائر پڑھا اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حضرتِ رازؔ کو زبان و بیان پر قدرتِ کامل حاصل ہے۔ غزل جیسی لطیف و نازک ترین صنفِ سخن کے جملہ مُطالبات کو اُنہوں نے پُورا کیا ہے۔ زندگی کے حقائق و دقائق پر اُن کی گہری نظر ہے۔ مُشاہدہ عمیق اور مُطالعۂ شعر و ادب وسیع ہے جس کے بغیر ایسی اچھی غزلوں کا معرضِ وجود میں آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ متنوع مضامین کو بحسن و خوبی غزل ہی کی زبان میں پیش کیا ہے۔ جذبات نگاری میں بھی اُنہوں نے چابک دستی سے کام لیا ہے ؎

نذرِ اربابِ وفا، شوق سے کر دیتے ہیں رازؔ
جذبۂ دل اگر الفاظ میں ڈھل جاتا ہے

جذبۂ دل ہی پر کیا منحصر ہے جناب رازؔ نے جس مضمون اور جس خیال کو بھی الفاظ میں ڈھالا ہے بڑی ہمدرمگی سے ڈھالا ہے۔ اُنہیں اپنی بصیرت و بصارت پر اعتماد ہے، وہ ذرّوں میں بھی مشاہدۂ مہر و ماہ کرتے ہیں اور قطروں میں اُنہیں دجلہ و جیحوں کی روانی اور گہرائی دکھائی دیتی ہے۔ انسان کے نہ صرف خال و خد بلکہ اُس کے سکوت و گویائی حتیٰ کہ تبسّم کو بھی وہ ایک مُفکر کی نظر سے دیکھتے ہیں ؎

مُسکراتے ہوئے چہروں پہ اگر غور کریں
لاکھ غم ایک تبسّم میں نہاں ملتے ہیں

چند سطروں میں جناب رازؔ کی غزلوں کی محاسن کا احاطہ ناممکن ہے۔ بقیدِ اختصار یہی کہا جا سکتا ہے کہ

اِک اِک غزلِ رازؔ ہے بے مثل و مثال
شائستہ مضامین کا دل آرا ہے جمال
اربابِ نظر یہی کہیں گے راغبؔ!
ہے "لہجۂ راز" رازؔ زیدی کا کمال

راغب مرادآبادی
۸/۱/۸۵

راز زیدی کی شاعری میں یہی جذبہ اور تمام جذبوں سے نمایاں ہے اور اسی سے ان کی انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔

مادی دُنیا کی تیز رفتار زندگی نے ہر شخص کو اپنی ذات میں نا آسودہ کر دیا ہے اور ہر شخص ایک اعصابی کرب میں مبتلا ہے اس دور کا انسان نہ فلسفہ سے آسودہ ہے نہ تصوّف سے اور نہ سائنس سے۔ فلسفہ نے اُسے نفسیاتی بیمار بنا دیا ہے، تصوّف کی افیون سے وہ کاہل اور بزدل ہو گیا ہے اور سائنس نے اسے ہر دوسرے انسان سے خوفزدہ کر دیا ہے اور مذہب جو تمام دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے اس کا بھرم سائنس کی ایجادات نے دُھندلا دیا اور مذہب کے ساتھ یہی سلوک فلسفہ کی موشگافیوں نے کیا غرض اس دور کا انسان ایسے کرب میں مبتلا ہے جس کا علاج کوئی تریاق نہیں۔ راز زیدی بھی حسّاس دل رکھتے ہیں وہ بھی یہ کرب محسوس کرتے ہیں بلکہ انہیں یہ کرب ہمہ جہت نظر آتا ہے اور وہ اس کا اظہار برملا اور بڑی سچائی سے کرتے ہیں ؎

زیست اک خوف ہے جس سے میں لرزتا ہی رہا
موت پیغام سکوں ہے وہ کبھی آ جائے

نظام عالم ہستی بدل گیا ہوتا — جو ساتھ ساتھ غموں کے خوشی نہیں ہوتی
یہاں کچھ کو تمکن بھی ہیں تو کیا ہے — بہت ہیں راہ میں سنگِ گراں بھی

اک سجدہ کی خواہش ہے وہ پا جائے گی تکمیل
کعبہ کا ہے در بند تو میخانہ کھُلا ہے

کبھی عزیز تھے ہم جن کو زندگی کی طرح
گزر گئے وہ برابر سے اجنبی کی طرح

ہم تو سب کو اچھا سمجھے — جانے لوگ ہمیں کیا سمجھے
اتنی دہشت تھی طوفاں کی — ساحل کو بھی دریا سمجھے

ان اشعار میں دل گداختگی کے ساتھ ساتھ آپ کو زندگی کے بھرپور تجربے محسوس ہوتے ہوں گے اور یہی راز زیدی کے کلام کی خصوصیت ہے وہ مضمون آفرینی کے لئے گداز اور سوز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کی شاعری میں بڑی اور اچھی شاعری کے تمام عناصر جستہ جستہ پائے جاتے ہیں اور یہ فی زمانہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

نازش دہلوی

ایک مُفکّر شاعِر

حضرتِ رازؔ زیدی کی غزلیں لہجۂ رازؔ کے نام سے منظرِ شہود پر آرہی ہیں۔ یہ امر اہلِ فکر ونظر کے لئے باعثِ مسرت ہے۔ میں نے لہجۂ راز کا مسودہ بنظرِ غائر پڑھا اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حضرتِ رازؔ کو زبان وبیان پر قدرتِ کامل حاصل ہے۔ غزل جیسی لطیف ونازک ترین صنفِ سخن کے جملہ مُطالبات کو اُنہوں نے پُورا کیا ہے۔ زندگی کے حقائق ودقائق پر اُن کی گہری نظر ہے۔ مُشاہدہ عمیق اور مُطالعۂ شعروادب وسیع ہے جس کے بغیر ایسی اچھی غزلوں کا معرضِ وجُود میں آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ متنوع مضامین کو بحسن وخوبی غزل ہی کی زبان میں پیش کیا ہے۔ جذبات نگاری میں بھی اُنہوں نے چابک دستی سے کام لیا ہے ؎

نذرِ اربابِ وفا، شوق سے کردیتے ہیں رازؔ
جذبۂ دل اگر الفاظ میں ڈھل جاتا ہے

جذبۂ دل ہی پر کیا منحصر ہے جناب رازؔ نے جس مضمون اور جس خیال کو بھی الفاظ میں ڈھالا ہے بڑی عمدگی سے ڈھالا ہے۔ اُنہیں اپنی بصیرت وبصارت پر اعتماد ہے، وہ ذرّوں میں بھی مشاہدۂ مہروماہ کرتے ہیں اور قطروں میں اُنہیں دجلہ دجیحوں کی روانی اور گہرائی دکھائی دیتی ہے۔ اِنسان کے نہ صرف خال وخد بلکہ اُس کے سکوت وگویائی حتیٰ کہ تبسّم کو بھی وہ ایک مُفکّر کی نظر سے دیکھتے ہیں ؎

مُسکراتے ہوئے چہروں پہ اگر غور کریں
لاکھ غم ایک تبسّم میں نہاں ملتے ہیں

چند سطروں میں جناب رازؔ کی غزلوں کی محاسن کا احاطہ ناممکن ہے۔ بقیدِ اختصار یہی کہا جاسکتا ہے کہ

اِک اِک غزلِ رازؔ ہے بے مثل ومثال
شائستہ مضامیں کا دل آرا ہے جمال
اربابِ نظر، یہی کہیں گے راغبؔ!
ہے "لہجۂ راز" رازؔ زیدی کا کمال

راغبؔ مرادآبادی
۸/۱/۸۵

خبر نہ تھی ہمیں ایسا بھی وقت آئے گا
کہ تو بھی تھک کے مرا ساتھ چھوڑ جائیگا

اسی خیال سے اقرارِ جرم ہے مجھکو
کہ چپ رہا تو یہ الزام تجھ پر آئے گا

یہ شامِ غم کے مسافر سحر بھی دیکھیں گے
ترا خیال اگر حوصلہ بڑھائے گا

تمہارے شہرِ تمنّا میں اک ہمی تو نہیں
نہ جانے شامِ طرب کون یاد آئے گا

تری گلی میں مکاں رازؔ نے بنا تو لیا
مگر وہ حوصلۂ غم کہاں سے لائیگا

لہجۂ راز

آرزو یہ ہے کہ موسم کوئی اچھا دیکھوں
دامنِ شوق میں پھولوں کو مہکتا دیکھوں

صحنِ گلشن میں جو صف بستہ ہیں نسرین و گلاب
ان کی ہر شاخ پہ بلبل کو چہکتا دیکھوں

دیکھ کر جھوٹ کا پھیلاؤ یہی سوچتا ہوں
نیند آئے تو کوئی خواب ہی سچا دیکھوں

ان کو ملنے سے بھی انکار ہے اللہ رے ضد
چاہتا تھا کبھی میں بھی انہیں سمجھا دیکھوں

اپنے گھر شام کو ہنستا ہوا پہنچے ہر شخص
غم کے شعلوں سے کسی کو نہ گذرتا دیکھوں

یہ تکلف زدہ بے فیض جواں ہوں روپوش
ہر قدم پر کوئی ہنستا ہوا چہرہ دیکھوں

بھیڑیئے، شیرِ ببر، سانپ تو دیکھے اکثر
اور اس دشت میں کیا جانئے کیا کیا دیکھوں

آرزو یہ بھی رہی اپنی ہمیشہ اے رازؔ
کھا کے ٹھوکر نہ کسی دوست کو گرتا دیکھوں

لہجۂ راز

کبھی عزیز تھے ہم جن کو زندگی کی طرح
گذر گئے وہ برابر سے اجنبی کی طرح

ہوائے گرم سے مرجھا گئے لب و رُخسار
وجودِ حسن ہے پھولوں کی پنکھڑی کی طرح

تراش دی ہے رہِ زیست اس طرح ہم نے
کہ رنج و غم بھی گذرتے رہیں خوشی کی طرح

تو ہی بتا، مرا شوق تمام کیا سمجھے
ہنسی بھی ہے ترے ہونٹوں پہ برہمی کی طرح

اگرچہ راستہ طے کر گئے بہت لیکن
وہ اب بھی دور ہیں ہم سے کسی خوشی کی طرح

کبھی تو رازِ خمیدہ سرِ نیاز کرو
کہ بندگی بھی درخشاں بھی خواجگی کی طرح

لہجۂ راز

جُرمِ الفت کے سزاوار بھی ہو سکتے ہیں
یہ حسین لٹتے روادار بھی ہو سکتے ہیں

گُل سمجھ کر جنھیں دامن میں لئے بیٹھے ہو
یہ شرارے ہیں شرربار بھی ہو سکتے ہیں

تیرے انداز کے یا میرے شکستِ دل کے
تذکرے ہیں سرِ بازار بھی ہو سکتے ہیں

جن کی گرمی سے بہا جاتا ہے دل خوں ہوکر
وہ تمہارے لب و رُخسار بھی ہو سکتے ہیں

بے بضاعت سے یہ ذرّے یہ ہواؤں کی نمی
مل کے بیٹھیں تو، یہ دیوار بھی ہو سکتے ہیں

راہ میں کوہ بھی حائل ہوں تو کیوں ڈرتے ہو
ہم سلامت ہیں یہ ہموار بھی ہو سکتے ہیں

جن کو ہر لحظہ ہو ہر شے میں کسی شے کی تلاش
وہ یقیناً کبھی فن کار بھی ہو سکتے ہیں

پیشِ رو جان کے ہم جن کے جلو میں ہیں رواں
ہم سفیرو وہ اداکار بھی ہو سکتے ہیں

ناز لطف و کرم دوست پہ اچھا نہیں رآز
یہ محل خوابوں کے مسمار بھی ہو سکتے ہیں

لہجۂ راز

کھوتے ہوتے ہیں جادۂ منزل کو پا کے ہم
احسان مند ہیں روشِ رہ نما کے ہم

کرتے چلے ہیں جادۂ منزل پہ روشنی
ہر گام پر چراغِ محبّت جلا کے ہم

جس نے غمِ حیات سے بیگانہ کر دیا
ممنون ہیں اسی غمِ راحت فزا کے ہم

خود دل کی دھڑکنوں نے کیا بڑھ کے آشکار
وہ راز جس کو رکھتے تھے دل میں چھپا کے ہم

یک سو کبھی نہ ہونے دیا حرص و آز نے
در پہ جھکے خدا کے کبھی نا خدا کے ہم

ہے پھر بھی اعتبار وفا وہ ستم شعار
سو بار جسکو دیکھ چکے آزما کے ہم

مخمور کر گئیں ہمیں نظریں کسی کی راز
اب کیا کریں گے ساغر و مینا اٹھا کے ہم

لہجۂ راز

شکستہ دل ہوں مگر سازِ بے صدا بھی نہیں
یہ اَور بات کوئی میرا ہم نوا بھی نہیں

شعارِ نور وہاں کر رہے ہیں آپ تلاش
جہاں چراغِ محبّت ابھی جلا بھی نہیں

ابھی سے ضبط کے دامن کو چھوڑ بیٹھے ہو
ابھی تو دردِ محبّت کی اِبتدا بھی نہیں

جو چل رہے ہیں مرے ساتھ ان کا ساتھی ہوں
جو رہ گئے ہیں اُنھیں مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

اگر یہ سچ ہے کہ دشواریاں ہیں راہوں میں
تو یہ بھی سچ ہے کہ رہ رو میں حوصلہ بھی نہیں

یہ شہرِ غم ہے یہاں غم کے چارہ ساز تو کیا
قریب و دور کوئی دردآشنا بھی نہیں

اُسی نے مشورہ ضبطِ غم دیا ہے مجھے
جو تلخیِ غمِ پنہاں سے آشنا بھی نہیں

یہ مانا ہو گیا اب رازِ منکشف لیکن
نگاہِ شوق کی اس میں کوئی خطا بھی نہیں

سجدہ ریزی ہی عمر بھر کی ہے
میکدے میں تو کچھ بسر کی ہے

تجھ سے دوری کا کیا گلہ کرتے
تیری قربت میں بھی بسر کی ہے

ہم نے لمحاتِ زندگی گِن کر
اپنی رفتار تیز تر کی ہے

آپ میرے لئے دعا نہ کریں
وہ بھی محتاج کچھ اثر کی ہے،

پوچھتا کون کس لئے آخر
ہم نے رو رو کے کیوں سحر کی ہے

یاں وفا جرم ہے مگر ہم نے
یہ جسارت بھی عمر بھر کی ہے

راز ایک پُر خلوص انساں کی
جستجو ہم نے عمر بھر کی ہے

لہجۂ راز

رہا نہ یاد جو اُستاد نے پڑھایا تھا
سبق وہ یاد ہے جو وقت نے سکھایا تھا

اِسی لئے تو کسی سے کبھی گِلہ نہ کیا
کہ جان بوجھ کے ہم نے فریب کھایا تھا

میں تجھ کو کھو کے بھی تنہا نہیں تھا صحرا میں
تپش تھی دھوپ کی سر پر غموں کا سایہ تھا

تلاش کرنے پہ وہ دشمنوں کی صف میں ملا
وہ اجنبی جو کبھی دوست بن کے آیا تھا

پھر اس کے بعد کہیں بھی نہ ہو سکا حاصل
سکونِ جاں جو تری قربتوں میں پایا تھا

اک اس خطا پہ ابھی تک ہے رآز شرمندہ
کبھی خیال میں دستِ طلب بڑھایا تھا

لہجۂ راز

ہم بیاں کرتے ہیں رودادِ محبت لیکن
آپ یوں سنتے ہیں جیسے کوئی افسانہ ہو

ہائے یہ دورِ عزیزانِ گرامی ہم سے
اس طرح ملتے ہیں جیسے کوئی بیگانہ ہو

یہ بیابان ہے انسان کی آواز کہاں
لوٹ کر دیکھئے شاید کوئی دیوانہ ہو

خواہشِ عیش و طرب فطرتِ انساں ہے لیکن راز
یہ الگ بات ہے انداز جداگانہ ہو

بند جب تک شراب خانہ رہے
ایک تقریرِ واعظانہ رہے

پاؤں کچھ ڈگمگا ہی جاتے ہیں
دو قدم جب وہ آستانہ رہے

کیجئے ظلم اعتراض نہیں
لیکن اندازِ دلبرانہ رہے

تو بھی تنہا ہے میں بھی تنہا ہوں
ماہِ تاباں کوئی فسانہ رہے

شب گذارو بخیر و خوبی رازؔ
کل نہ جانے کہاں ٹھکانہ رہے

لہجۂ راز

ہر شخص اپنا دوست ہے کس کس کا نام لیں
سب زخم مندمل ہوئے کیا انتقام لیں

ہم بیخودی میں آ ہی گئے اس مقام تک
اپنا پیام دیں نہ کسی کا پیام لیں

آواز پر مکاں سے نکلتا نہیں کوئی
کس سے کہیں جناب ہمارا سلام لیں

ہے رہ گذار ایک مگر فاصلہ بھی ہے
کیسے کہوں کہ آپ مرا ہاتھ تھام لیں

رازؔ اس صدی کے حافظؔ و خیامؔ جوشؔ ہیں
آپ ان کا نام لیں تو بصد احترام لیں

لہجۂ راز

غم مجھے کیا ہیں تجھے بھی نہ خبر ہو شاید
اس جہاں میں یہی افتادِ بشر ہو شاید

عقل کہتی ہے کہ سو جاؤ اندھیرا ہے ابھی
دل یہ کہتا ہے یہی وقتِ سفر ہو شاید

ہر نئی راہ میں دیوار کھڑی ہے لیکن
دیکھتے ہیں کسی دیوار میں در ہو شاید

یا تو فطرت نے ہر اک شے کو بنایا ہے حسین
ورنہ پھر یہ بھی مرا حسنِ نظر ہو شاید

کل جو پھرتا تھا بھٹکتا ہوا صحراؤں میں
رہ روِ شوق ترا عزمِ سفر ہو شاید

ہم تو اس کو فلکِ پیر ہی کہتے ہیں مگر
آپ کہتے ہیں تو یہ حدِ نظر ہو شاید

آتشِ شوق نے یوں رازؔ جلایا ہے مجھے
اب مری نظم کا عنواں ہی شرر ہو شاید

لہجۂ راز

کچھ فکر و تجسس شوق و طلب منزل کی لگن اور ذہنِ رسا
یہ سارے عوامل مل جل کر قسمت کا ستارہ ہوتے ہیں

ہے عزم جواں تو خوف نہ لا طوفانِ حوادث کا دل میں
طوفانِ حوادث بھی اکثر بے مثل سہارا ہوتے ہیں

ہر سمت سے دشمن گھات میں ہے یاں رد و قدح ہر بات میں ہے
کیا جانئیے یہ حالات ہمیں کس طرح گوارہ ہوتے ہیں

جب جہد و عمل سے طوفاں کا رخ موڑ دیا تو راز کھلا
کشتی کے شکستہ ٹکڑے بھی مضبوط کنارہ ہوتے ہیں

لہجۂ راز

آستینوں میں کبھی سانپ بھی پالا جائے
اِک فسانے کو حقیقت میں بھی ڈھالا جائے

سچ کی مینار تک اک جھوٹ کو لانے کے لئے
جھوٹ کو اور ابھی اور اچھالا جائے

دل کو مدہوشی کا عالم ہی سکوں دیتا ہے
جاں نکلتی ہے اگر ہوش سنبھالا جائے

جو تصوّر میں بھی آتے ہوئے شرماتی ہو
کیسے اِس شکل کو اشعار میں ڈھالا جائے

گھر میں آرام سے بیٹھا نہیں جاتا یارو
سر کے چکر کو مرے پاؤں میں ڈالا جائے

روشنی ایسی تو ہو آپ کے گھر کی اے رازؔ
کم سے کم چند گھروں تک تو اجالا جائے

لہجہ راز

ایک لمحہ بھی سفر کا نہ گنوایا میں نے
دھوپ سے بچنے کو ڈھونڈا نہیں سایا میں نے

کیا بنا میرا مجھے اس کا بھی احساس نہیں
اپنا کردار تو خوبی سے نبھایا میں نے

دور جو ہو گیا اس کا کبھی پیچھا نہ کیا
جو قریب آیا گلے اس کو لگایا میں نے

دی نہ حالات نے دم لینے کی مہلت پھر بھی
زندگی تجھ سے بہت لطف اٹھایا میں نے

مجھ سے جو بن نہ سکیں عالمِ بیداری میں
ان عمارات کو خوابوں میں سجایا میں نے

اپنی محرومی پہ یوں مجھ سے خفا ہیں جیسے
ان کے منصوبوں کو ناکام بنایا میں نے

بچ کے طوفاں سے سلامت نکل آیا تھا مگر
خود کو پھر اِک نئے گِرداب میں پایا میں نے

بن کے دشمن تو کوئی سامنے آیا نہ کبھی
دے گیا زخم کوئی دوست تو کھایا میں نے

سچ یہ ہے راز کہ اِس شہر میں جینے کے لئے
جسم کو اپنے بہت ناچ نچایا میں نے

لہجۂ راز

پابندِ حیا ہے کہیں وابندِ قبا ہے
ہر مملکتِ حسن کا دستور جدا ہے

جب ٹوٹ گئے پائے طلب راہِ طلب میں
تب جا کے کہیں سمت کا اندازہ ہوا ہے

کچھ اور ہی شے ہے جسے میں پا نہ سکا ہوں
اس زلفِ رسا تک تو مرا ہاتھ گیا ہے

اِک سجدہ کی خواہش ہے وہ پا جائیگی تکمیل
کعبہ کا ہے در بند تو مے خانہ کھلا ہے

ہم پیتے رہے بادۂ پرکیف سمجھ کر
احباب نے گر زہرِ ہلاہل بھی دیا ہے

مصروف جراحت ہے ابھی چارہ گرِ وقت
بیمار محبت ہے کہ دم توڑ چکا ہے

کعبہ ہو صنم خانہ ہو مسجد ہو کہ صحرا
جس سمت بڑھا رآز دلیرانہ بڑھا ہے

لہجۂ راز

دیواریں مسمار کریں یا کوہِ گراں ہموار کریں !
عشق میں ہم مجبور سے انساں کیا کیا کاروبار کریں

حسن جواں اور چاک گریباں کیسے آنکھیں چار کریں
مرنا بھی آسان نہیں ہے جینا کیوں دشوار کریں

چاند کے سائے سائے ہم اِس شرط پہ رخصت کرتے ہیں
چاند کی صورت آپ بھی کل پھر آنے کا اقرار کریں

ہاتھوں تک آتے آتے وہ پرچھائیں بن جاتی ہے
چاہت سے جس شے کا تعاقب ہم دیوانہ وار کریں

راہِ وفا میں آج بھی جن کے خون سے شمعیں روشن ہیں
کیسے ہم اُن دیوانوں کی عظمت سے انکار کریں

وقت کی برق خرامی سے مایوس نہ ہو اے راہرو
منزل اپنی دور نہیں ہے تیز اگر رفتار کریں

جانا ہے تو جیسے تیسے منزل تک جا پہنچیں گے
آزؔ شکستہ پا ہیں لیکن ہم یہ کیوں اظہار کریں

لہجۂ راز

اندھیرا دُور ہوا روشنی میں آنے لگے
خزاں نصیبوں کے چہرے بھی تمتمانے لگے

وہ داغ چہرۂ انسانیت پہ آنے لگے
کہ جن کو دیکھ کے حیواں بھی خوف کھانے لگے

یہ کیسے گیت نگارانِ شہر گانے لگے
کہ سازہائے طرب غم سے جھنجھنانے لگے

یہ رعب حسن ہے یا ندرتِ بیاں ہے کہ ہم
فریب خوُردہ ہیں پھر بھی فریب کھانے لگے

وہ کیفیت دلِ رنجور کی نہ پوچھ کہ جب
کسی درخت کے سائے میں نیند آنے لگے

مزاجِ دوست سمجھنا تو اور بات ہے راز
ہمیں تو خود کو سمجھنے میں بھی زمانے لگے

لہجۂ راز

نقشِ وفا جو چھوڑ آئے تھے بستی میں ویرانے میں
وہ کردار بنے اور ابھرے ہر اچھے افسانے میں

کہہ کر سُن کر دُکھ ہوتا ہے اچھی سچی باتوں میں
ہم نے کتنا جھُوٹ ملایا بالک کو بہلانے میں

برسوں تک جس درد و الم سے دل کو بچا کر رکھا تھا
تم اِس درد کو دل تک لائے ایک پلک جھپکانے میں

مہکی مہکی سادہ و رنگین سیج پہ سونے والے دیکھ
کتنی کلیوں نے دم توڑا ہے صرف اک سیج سجانے میں

جیون گُتھی کو سلجھا گئے تھے وہ کتنے سیانے لوگ
ہم تو راز اُلجھ کر رہ گئے اس کے تانے بانے میں

لہجۂ راز

خوشبوئے زلفِ یار مرے شہر میں نہیں
دل کو مِرے قرار مرے شہر میں نہیں

حاصل ہو جس سے غنچۂ دل کو شگفتگی
وہ جوششِ بہار مرے شہر میں نہیں

ہر دل بجھا ہوا ہے پریشاں ہے ہر نظر
ہوگی کہیں بہار مرے شہر میں نہیں

داغوں نے میرے دل کو گلستاں بنا دیا
کیا ہے جو لالہ زار مرے شہر میں نہیں

ہم کیا رکھیں وفا کی توقع کسی سے راز
لوگوں کا یہ شعار مرے شہر میں نہیں

نہ دل رہا نہ دل کے تاثرات رہے
مگر حیات کے کچھ تلخ تجربات رہے

اب ان کے مصرف بیجا پہ دل پشیماں ہے
جو چند لمحے کبھی حاصلِ حیات رہے

کیا ہے عشق نے ہر دور میں قبول انہیں
حریم حسن کے جو بھی مطالبات رہے

گلہ نہیں ہے تری کج ادائیوں کا مجھے
مری حیات میں شامل یہ حادثات رہے

میں خود ہی سنگِ حوادث کے انتظار میں ہوں
کہ نغمہ ریز مرا شیشۂ حیات رہے،

اب اس سے بڑھ کے کوئی اور شے عطا ہو مجھے
نقوشِ غم بھی مرے دل پہ بے ثبات رہے

کسی کے وعدۂ صبر آزما کے شوق میں رازؔ
ہمارے ذہن میں کیا کیا تصوّرات رہے،

وہ آتے اور گھٹا بھی اُٹھی اتفاق سے
ہر بات لاجواب ہوئی اتفاق سے

سن تو رہا تھا پوری توجہ سے اُنکی بات
آنکھوں میں نیند آ ہی گئی اتفاق سے

دستک ہوئی جو در پہ تو ایسا لگا مجھے
ملنے کو آ گئے ہو تم ہی اتفاق سے

کچھ روشنی کی سمت بڑھے ہم قدم قدم
کچھ روشنی بھی بڑھتی رہی اتفاق سے

دیکھا نئے لباس میں خود کو تو رو دیا!
پھر آگئی لبوں پہ ہنسی اتفاق سے

اے رازؔ ہم کو ایسی توقع نہ تھی مگر
شہرت ہماری ہو ہی گئی اتفاق سے

لہجۂ راز

کس درجہ بلندی پہ مرا ذوق طلب ہے
آسودہ مرا دل کبھی پہلے تھا نہ اب ہے

مدھم سی چمک سی ہے مرے بجھتے ہوئے دل میں
مبہم سی اک اُمید ہی جینے کا سبب ہے

مردہ ہوں کہ ہر سمت سے لاشوں میں گھرا ہوں
زندہ ہوں کہ زندہ مرا احساسِ طرب ہے

تہہ گرد کی ایسی ہے کہ ہم کہہ نہیں سکتے
یہ دن کا اُجالا ہے کہ تاریکیٔ شب ہے

پردے تو حقائق سے ہٹے جاتے ہیں لیکن
تم قفل دیئے بیٹھے ہو ذہنوں کو غضب ہے

حالات کے اس فرق کو کیا کہتے ہو یا رَو
یہ درد کی تصویر ہے وہ خندہ بلب ہے

سائے میں رہیں آپ کہ ہوں دھوپ سے بیتاب
اے صحرا نورد وا نھیں تشویش ہی کب ہے

کردار کے آئینے سے ہوتی ہے نمُو دار
اے راز شرافت کا حسب ہے، نہ نسب ہے

لہجۂ راز

پائے انسانیت فگار بھی ہے
سر پہ منزل کی دھن سوار بھی ہے

زندگی میں رہیں جو گرمِ عمل
ان کو جینے کا اختیار بھی ہے

ہم پلے ہیں خزاں کے سائے میں
ہم کو اندازۂ بہار بھی ہے

کچھ تو ماحول سازگار نہیں
کچھ خیالوں میں اِنتشار بھی ہے

تیرے وعدوں کے آبشار میں گم
میری دنیائے اِعتبار بھی ہے

ہے محبّت وہ کارزارِ جہاں
ہر قدم جیت بھی ہے ہار بھی ہے

اُن کی محفل میں کیا نہیں اے راز
بیقراری بھی ہے قرار بھی ہے

لہجۂ راز

جل گیا دل تو کہیں اس کا نشاں ہی ہو گا
نہ سہی آگ تو ہلکا سا دھواں ہی ہو گا

صرف اک جھوٹ کی قیمت ہے اک انساں کا ضمیر
سچ تو پھر سچ ہے بہر حال گراں ہی ہو گا،

اس لئے چھوڑ گئے لوگ وفاؤں کے نقوش
وہ نہ ہونگے تو کوئی اُن کا نشاں ہی ہو گا

لے گیا ساتھ بہا کر میرے خوابوں کے محل
شبِ گذشتہ وہ کوئی سیلِ رواں ہی ہوگا

ایسی خاموشی سے بہتر ہے کہ میخانے چلیں
کچھ نہ ہوگا تو وہاں ذکرِ بتاں ہی ہوگا

میں سکوں کا متلاشی تھا ادھر آ نکلا
کیا خبر تھی مجھے یہ تیرا مکاں ہی ہوگا

میں تو اک گاؤں میں رہتا ہوں مجھے کیا معلوم
گھر ترا شہر میں فردوس نشاں ہی ہوگا

لہجۂ راز

تعبیر جسے کرتے ہیں ہم جہدِ وعمل سے
کہتے ہیں اسے عشق بھی کچھ ردّ وبدل سے

رنگینیاں صحرا میں جنم لیتی ہیں کیوں کر
معلوم بھی ہو گا کبھی نکلو تو محل سے

دن رات وہی تیشہ زنی کوہ نوردی
یہ شہر بھی کچھ کم تو نہیں دشت وجبل سے

کرتے ہو اگر ظلم کسی پر تو یہ سوچو
پاؤ گے کہاں جا کے اماں ردِ عمل سے

اس جرم پہ کچھ تازہ خدا سجدہ طلب ہیں
کیوں بر سرِ پیکار تھے ہم لات و ہبل سے

تخیلِ وفا گرچہ دل آویز ہے لیکن
ثابت بھی کریں آپ کبھی طرزِ عمل سے

رکھتے نہیں ہم وعدۂ فردا پہ یقیں راز
مانا کہ بہت دور نہیں آج بھی کل سے

لہجۂ راز

زہرِ غم دل میں اتر جانے دو
جو گزرتی ہے گزر جانے دو

رابطہ جن کا حقیقت سے نہ ہو
ایسے خوابوں کو بکھر جانے دو

ایک دن خود ہی چھلک جائے گا
اور پیمانے کو بھر جانے دو

موج سرتاب بنیں گے ہم بھی
سر سے طوفاں تو گذر جانے دو

تم قدم اپنا بڑھاتے ہی رہو
جو ٹھہرتا ہے ٹھہر جانے دو

آکے بیٹھے ہیں ابھی بزم میں راز
چند ساعت تو ٹھہر جانے دو

لہجۂ راز

جن میں ہر لحظہ مسرّت کبھی لیتی تھی جنم
آج وہ آنکھیں نظر آتی ہیں شبنم شبنم

شادابِ عشق کے اس موڑ پہ جا پہنچا دل
کہ جہاں درد کا احساس بھی کچھ ہوتا ہے کم

میں نے یہ سمجھا کہیں جشنِ چراغاں ہوگا
روشنی جب بھی ہوتی ہے مرے گھر میں مدھم

میرے اندر سے کوئی کہتا ہے دیکھو نہ اُدھر
جب بھی اُٹھا کسی جانب سے کوئی دستِ کرم

سرکشی جس کی بہت سخت گراں تھی دل پر
آج وہ ابرِ کرم صحن میں برسا چھم چھم

جسکے ہونے سے بہت دل کو سکوں حاصل تھا
وہ تصور بھی ہوا ذہن میں درہم برہم

عقل حیران و پریشاں ہے کہ کس کو پوجوں
ایک نادیدہ خدا سامنے دو چار صنم

اس کو منزل کے نہ ملنے کی شکایت کیا خوب
جو سفر کو نہ چلا گھر سے کبھی چند قدم

آزمائیں صورتِ حالات بھی کیسے لکھیں
روشنی ہو گئی کم پاس نہ کاغذ نہ قلم

لہجۂ راز

کھلے گل ہائے رنگیں اور شاخوں میں ثمر آئے
مگر دیکھا تو ہر جانب کڑے پہرے نظر آئے

سنہرے خواب تھے نظروں میں لیکن جب کھلیں آنکھیں
تو خود پر مسکراتے چاند اور تارے نظر آئے

تری آمد سے یہ عالم ہوا ہے بزمِ عالم کا
افق پر صبح دم جیسے کئی سورج ابھر آئے

جہاں لاکھوں ستارے ذہنِ انساں نے کئے روشن
وہیں تاریک سائے اور بھی نیچے اتر آئے

حسیں دُنیا مکمل طور پر ہو جلوہ گر کیوں کر
وہیں شوریدہ سر پہنچے جہاں کچھ شیشہ گر آئے

نہیں ہے ہوش جب اہلِ خرد کو جیب و داماں کا
تو یہ الزام بھی کیوں آزؔ دیوانوں کے سر آئے

یہ مانا زندگی بھی اک چبھن ہے
مگر دار و رسن دار و رسن ہے

کھلا ہے پھول بھی گر اتّفاقاً
میں یہ سمجھا مجھی پہ خندہ زن ہے

میں ہر پتّھر سے سر ٹکرا رہا ہوں
مِری جراَت مِرا دیوانہ پن ہے

تضادِ فطرتِ انساں تو دیکھو
کوئی بت گر ہے کوئی بت شکن ہے

کبھی جینے کو بھی تھی فن کی ضرورت
مگر اس دور میں جینا بھی فن ہے

ہر اک منزل سے بیباکانہ گذرے
یہی تو زندگی کا بانکپن ہے

کہاں جا کر مسافر جاں بچائے
یہاں ہر موڑ پر اک راہزن ہے،

رہے گا زندگی بھر راز دل میں
یہی گر آپ کا طرزِ سخن ہے

لہجۂ راز

وفورِ شوق کو ہے دردِ لادوا کی تلاش
ہے ابتدائے محبّت میں انتہا کی تلاش

اسی اُمید پہ جیتے ہیں ہم کہ آخرِ کار
تمہیں بھی ہوگی کبھی دردِ آشنا کی تلاش

چلا ہے چاند کی جانب یہ آدمی کہ جسے
کبھی دُعاؤں کی حاجت کبھی دوا کی تلاش

جگاؤ جوت اگر خود جگا سکو ورنہ
عبث ہے اس شبِ تاریک میں ضیا کی تلاش

جنونِ عشق کی بے اعتدالیاں توبہ
کبھی حیات پہ مائل کبھی قضا کی تلاش

ہے جستجو تو کہیں اور جا کے ڈھونڈئے آز
ہمارے شہر میں بیکار ہے وفا کی تلاش

لہجۂ راز

پھول مانگیں تو یہاں سنگ گراں ملتے ہیں
حوصلے پھر بھی محبّت کے جواں ملتے ہیں

کیا گذر جاتی ہے حساس دلوں پر مت پوچھ
دھوپ میں جب گلِ نوخیز تپاں ملتے ہیں

مسکراتے ہوتے چہروں پر اگر غور کریں
لاکھ غم ایک تبسم میں نہاں ملتے ھیں

دامنِ زیست میں وسعت ہے مگر انساں کو
چند لمحے بھی محبّت کے کہاں ملتے ہیں

کچھ حقائق بھی پسِ پردہ چلے جاتے ہیں
کچھ فسانے بھی یہاں وردِ زباں ملتے ہیں

یوں گلے ملتے ہیں افزائش غم سے کچھ لوگ
جیسے آپس میں لبِ ماہ وشاں ملتے ہیں

بات کرنے کی اجازت ہو تو اتنا پوچھوں
مسکرانے سے یہ انداز کہاں ملتے ہیں

اور اک شخص بھی اس راز سے وابستہ تھا
اس گذرگاہ میں کچھ ایسے نشاں ملتے ہیں

لہجۂ راز

راہ کا پتھر بھی جس کو تیرا سنگِ در لگے
کون جانے رات کو اسکا کہاں بستر لگے

خوبیِ قسمت کہوں یا چارہ گر کا التفات
اک ذرا سا زخم تھا اور سینکڑوں نشتر لگے

ڈوبنا کشتی کو ہے ساحل پہ یا منجدھار میں
دیکھنا یہ ہے کہ یہ الزام کس کے سر لگے

پھول تو جانے کہاں کِس پہ نچھاور ہو گئے
جس قدر پتھر چلے آ کر مرے سر پر لگے

زندگی کی دھُوپ نے جھلسا دیا ہے اِسقدر
پیڑ برگد کا بھی مجھکو خوبصورت گھر لگے

راہ سے بھٹکا ہوا ہر اک نظر آیا مگر
چال کے انداز سے اے رآز سب رہبر لگے

لہجۂ راز

عشق راحت فزا کہاں ہے ابھی
دور منزل سے کارواں ہے ابھی

مجھ سے بزمِ طرب کی بات نہ کر
مرا احساسِ غم جواں ہے ابھی

بجھ گئی آگ مُدتیں گزریں
پھر بھی چاروں طرف دھواں ہے ابھی

غیر کو کیسے اعتماد میں لوں
دوست ہی مجھ سے بدگماں ہے ابھی

ہوس و عشق میں تمیز کریں
اتنی فرصت انہیں کہاں ہے ابھی

عشق پہنچا بھی چاند تک لیکن
وسعتِ حسن بیکراں ہے ابھی

منتشر ہو چکے حواس مگر
یاد تیری سکونِ جاں ہے ابھی

جانے کتنے سفینے ڈوب چکے
غم کا دریا رواں دواں ہے ابھی

موت کی فکر کیا کریں اے رآز
زندگی ہم پہ مہرباں ہے ابھی

لہجۂ راز

یہ بھی اِک کیفیتِ عشق و جنوں ہے ورنہ
دشت کی راہ میں دیوار کہاں سے آئی

جب تری بزم کہ ہے شامِ طرب صبحِ نشاط
پھر یہاں آہِ شرر بار کہاں سے آئی

کوئی پابندِ سلاسل نہ جنوں خیز فضا
پھر یہ زنجیر کی جھنکار کہاں سے آئی

یہ خیال آیا مجھے لذّتِ اظہار کے بعد
مجھ میں یہ جرأتِ گفتار کہاں سے آئی

دل نے اک گُل کے تصوّر سے سکوں پایا تھا
ذہن میں وادیٔ پُرخار کہاں سے آئی

جب نہیں کوئی بھی ساتھی غمِ تنہائی کا
نکہتِ گیسوئے دلدار کہاں سے آئی

لہجہ راز

واعظ تو خاموش ہوا کچھ میخانوں کی بات کرو
جن کو اپنا ہوش نہیں ان دیوانوں کی بات کرو

جن کو حاصل عیش فراواں ان سے ہم کو نسبت کیا
آرزو کے مدفن ہیں ان انسانوں کی بات کرو

طنز کسی مجبورِ وفا پر کرنا کچھ دشوار نہیں
ایوانوں میں پلنے والے رومانوں کی بات کرو

گذر گئی جو طوفاں بن کر اس خواہش کا کیا کہتے
گھٹ گھٹ کر دم توڑ گئے ان ارمانوں کی بات کرو

ہم پر بیتی ہم سے پوچھو تم کو زیب نہیں دیتا
بیٹھ کے ساحل پر لوگوں سے طوفانوں کی بات کرو

شہر کی گہما گہمی سے دیوانوں کو وحشت ہوتی ہے
سہمے سمٹے ہرنوں کی کچھ ویرانوں کی بات کرو

رآز سے تم نے تذکرۂ اربابِ خرد بیکار کیا
دیوانے سے ملتے ہو تو دیوانوں کی بات کرو

لہجۂ راز

جن کو نہیں معلوم کہ ہے شوق وَ طلب کیا
اب ان کو بتاؤں میں تباہی کا سبب کیا

رنجش تھی اگر دل میں تو پھر آتے ہی کیوں تھے
آئے ہو تو اب لوٹ کے جانے کا سبب کیا

تجدیدِ ملاقات نہ آغاز تکلّم
بیٹھے رہیں یوں بزم میں ہم مہرِ بہ لب کیا

ایسے بھی ہیں انساں جنھیں معلوم نہیں ہے
دنیا کے نہاں خانے میں ہیں عیش و طرب کیا

دراصل کمی ہوتی ہے کچھ جہد و عمل میں
ورنہ دُرِ مقصود نہ پانے کا سبب کیا

ملنے کی توقع تو کچھ ان سے نہیں لیکن
بن جائے کوئی حادثہ تقریب عجب کیا

رستا ہے لہو زخمِ ستم کیوں کہتے ہوا ے آزؔ
سی دے گا ابھی آکے کوئی زخم کے لب کیا

لہجۂ راز

نہ بلائیں یہ اہتمام تو ہے
سرِ فہرست میرا نام تو ہے

سایۂ زلف ہم سے دور سہی
اک حسیں شہر میں قیام تو ہے

نہ سہی راستے میں سبزہ و گل
ہم سفر تم سا خوش کلام تو ہے

دشت سے شہرِ کامیابی تک
فاصلہ صرف چند گام تو ہے

سازِ بے ساختہ ہے مذہبِ عشق
پھر بھی مقبولِ خاص و عام تو ہے

بات جب شام کی چلی تو کہا
چند لمحوں کے بعد شام تو ہے

آپ اتنے اُداس کیوں ہیں رازؔ
آپ کا بھی کوئی مقام تو ہے

لہجۂ راز

عکسِ ماضی کا مرے سامنے لاتے کیوں ہو
زندگی اور بھی دشوار بناتے کیوں ہو

ہے یہ وہ دور کھلے جاتے ہیں اسرارِ رموز
تم حقائق کو پسِ پردہ چھپاتے کیوں ہو

جانے والوں سے یہ کہہ کر کہ سنبھل کر جانا
راہ کو اور بھی دشوار بناتے کیوں ہو

رقص کرتے ہوئے پھر اہلِ جنوں آئیں گے،
راز ویرانوں میں تم شہر بساتے کیوں ہو

راز
لہجہٴ

ہر لمحہ کو اپنے لئے اُفتاد کیا ہے
آزارِ محبّت سے بھی دل شاد کیا ہے

جب دامنِ خوش رنگ کوئی ہاتھ نہ آیا
بے رنگ فضاؤں سے بھی دل شاد کیا ہے

الفاظ وہیں روک دیئے ضبط نے بڑھکر
وا شوق نے جب بھی لب فریاد کیا ہے

اب اس کی بلا تاخیر تباہی پہ ہے لرزاں
انساں نے جو تازہ سِتم ایجاد کیا ہے

ان زہرہ جبینوں نے خردمندوں کو اے آز
وامق کبھی مجنوں کبھی فرہاد کیا ہے

لہجۂ راز

ہر درد کو پُر کیف بنا میری طرح سے
پھر بزم میں اک شان سے آ میری طرح سے

مدّت ہوتی تم صحنِ چمن تک نہیں آتے
ہر غنچہ ہے آغوشِ کُشا میری طرح سے

اب ظلم یہ ہے آپ جفا بھی نہیں کرتے
خاموش ہیں سب ناز و ادا میری طرح سے

جب یاد کوئی شور مچانے لگے دل میں
اِس یاد کو سینے سے لگا میری طرح سے

گھر کو تو چراغِ رُخِ روشن سے سجایا
کچھ داغِ جگر پر بھی سجا میری طرح سے

وارفتہ ہوں میں مجھ پہ ہی تجدیدِ عمل کر
اوروں کو نہ دیوانہ بنا میری طرح سے

کیا جانیے کیا حال مکینوں کا ہو آرز
ویران ہے ہر شہرِ وفا میری طرح سے

راز
لہجۂ

ہم تو سب کو اچھا سمجھے
جانے لوگ ہمیں کیا سمجھے

بات بھی کرتے ہیں ذومعنی
وہ کیا کہہ گئے ہم کیا سمجھے

اتنی دہشت تھی طوفاں کی
ساحل کو بھی دریا سمجھے

دیکھ کے اُن کی آنکھ میں آنسو
اپنا اُن سے ناتا سمجھے

کوئی خوشی جب ہم تک پہنچی
تیز ہوا کا جھونکا سمجھے

پائی جب ہر شے بیگانی
غم ساگر کو اپنا سمجھے

ساتھ رہا یوں درد کہ اسکو
اکثر جسم کا حصّہ سمجھے

لہجۂ راز

جن پہ صدیوں سے چٹانوں نے قدم گاڑے تھے
دیکھتے دیکھتے وہ راستے ہموار ہوتے

جن کو ہم نے رہِ منزل سے کیا تھا آگاہ
وقت آیا تو وہی راہ میں دیوار ہوتے

لوگ پی پی کے گئے کچھ نہ کہا ساقی نے
ہم فقط ہاتھ لگانے کے گنہگار ہوتے

کل جو کہتے تھے زمانے کے مددگار ہیں ہم
آج اے رازؔ وہ بے یار و مددگار ہوتے

لہجۂ راز

چاہتے ہم بھی ہیں تجدیدِ ملاقات مگر
اتنی فرصت ہمیں حالات کہاں دیتے ہیں

دل میں ہے جذبۂ ایماں نہ عبادت میں خلوص
پھر بھی ہر شہر میں کچھ لوگ اذاں دیتے ہیں

بہت آتے رہے شیریں بیاں بھی
رہیں باقی جہاں میں تلخیاں بھی

کئی دن سے سماعت پر گراں ہیں
نسیمِ صبح کی سرگوشیاں بھی

یہاں کچھ کوہ کن بھی ہیں تو کیا ہے
بہت ہیں راہ میں سنگِ گراں بھی

عجب دورِ نفاست ہے کہ دل میں
نہیں رہتا حسابِ دوستاں بھی

جو نغمہ پھوٹتا ہے سازِ دل سے
اُسی کو پیش کرتی ہے زباں بھی

سن اے وارفتۂ فصلِ بہاراں
کوئی پیغام لاتی ہے خزاں بھی

کبھی آجاؤ میخانے میں واعظ
یہاں آتی ہے آوازِ اذاں بھی

نظر ہے راز سوئے آسماں کیوں
زمیں پر چاند بھی ہیں کہکشاں بھی

لہجۂ راز

آپ کیوں سہمے ہوتے ہیں کیا ہُوا
عِشق رسوا ہو گیا اچھّا ہُوا

مدتیں گزریں مگر اِک حادثہ
آج تک ہے ذہن پر چھایا ہُوا

جب کوئی رنگیں قبا آیا نظر
ہم کو فوراً آپ کا دھوکا ہُوا

وہ مری بیچارگی پر ہیں ملول
اب اُنہیں کچھ غم کا اندازہ ہوا

بات اس دنیا کی زاہد پر ہے شاق
جانے کس عالم میں ہے کھویا ہوا

تم بھی بدلو راز کچھ اپنی روش
ہے بہت رنگِ جہاں بدلا ہوا

لہجۂ راز

آج ہم نے غمِ دوراں سے رہائی پائی ،
آج پھر آئیں گے وہ یاد یہی تو غم ہے ،

لہجۂ راز

ہوا کی لہروں میں پھولوں کو مسکرانے دے
فضا تے شہر کو رنگین تر بنانے دے

کسی کو یاد تو کرلوں کوئی صدا تو سنوں
مجھے بھی تھوڑی سی فرصت کبھی زمانے دے

ہمیں تو چاہیئے کچھ شب گذارنے کے لئے
حقیقتوں کی کمی ہے تو کچھ فسانے دے

ترس رہا ہوں محبّت کے چند لمحوں کو
کسی سراب سے یہ تشنگی بجھانے دے

بنا کے رکھ دیا تو نے ہدف ملامت کا
کبھی تو مجھ کو بھی نخوت سے سر اٹھانے دے

یقیں ہے مجھ کو گرائے گا تو کہیں لیکن
ابھی ٹھہر مجھے کچھ اور لڑکھڑانے دے

کنول دلوں کے کھلیں اور راز بھی نہ کھلے
کبھی لبوں کو تبسم کسی بہانے دے

لہجۂ راز

تھا دل میں کسی کے نہ کبھی وہم و گماں بھی
دنیا میری ہو جائیگی فردوس نشاں بھی

سوچا کبھی مرنے کے لئے میں نے تو یہ دل
انکار بھی کرتا رہا آہستہ سے ہاں بھی

ہے آہ بہ لب رازؔ تو حیرت ہے انھیں کیوں ہے
لگتی ہے کہیں آگ تو اٹھتا ہے دھواں بھی

لہجۂ راز

جانے کیا بات ہے ہر شرح و بیاں کے باوصف
بُت پرستی بھی ہوئی خوب خدا کے ہوتے،

نارسائی کا یقیں ہوتا ہے دل میں لیکن،
لوگ کرتے ہیں دعائیں بھی دعا کے ہوتے

غم فزوں تر تھا تو میخانے میں آتے کہ یہاں
کچھ نہ ہوتا تو جنوں خیز دھماکے ہوتے

لہجۂ راز

نہ پوچھو ہم سے گل و برگ و بار کتنے ہیں
ابھی چمن میں ہمیں اختیار کتنے ہیں

ذرا سی لغزشِ پا سے یہ ہو گیا معلوم
کہ اس جہاں میں مرے غمگسار کتنے ہیں

ابھی شباب ہے یہ دیکھنا شباب کے بعد
تمہارے عشق میں دل بیقرار کتنے ہیں

غموں سے عہدہ برآ ہو سکے تو یہ بھی دیکھ
مسرتوں سے یہاں ہمکنار کتنے ہیں

شمار کر نہ سکو گے اگر شمار کرو
کہ اِس زمیں پہ بھی پروردگار کتنے ہیں

جو پی کے ہو گئے مدہوش ان کو کیا معلوم
تپیدہ جسم سر جوئے بار کتنے ہیں

زمانہ روند گیا راز ان کا ذکر ہی کیا
ہمیں کو دیکھ لو ہم باوقار کتنے ہیں

لہجۂ راز

وہ آتے اور گھٹا بھی اُٹھی اتفاق سے
ہر بات لاجواب ہوئی اتفاق سے

سُن تو رہا تھا پوری توجہ سے اُنکی بات
آنکھوں میں نیند آہی گئی اتفاق سے

دستک ہوئی جو در پہ تو ایسا لگا مجھے
ملنے کو آگئے ہو تم ہی اتفاق سے

کچھ روشنی کی سمت بڑھے ہم قدم قدم
کچھ روشنی بھی بڑھتی رہی اتفاق سے

دیکھا نئے لباس میں خود کو تو رو دیا!
پھر آگئی لبوں پہ ہنسی اتفاق سے

اے رازؔ ہم کو ایسی توقع نہ تھی مگر
شہرت ہماری ہو ہی گئی اتفاق سے

لہجہ راز

ہر بات چھپاتا ہے الفاظ کے پردے میں
دراصل حقائق سے انسان گریزاں ہے

لہجۂ راز

ہوش والوں سے نہیں پوچھتے دیوانوں سے
ہاتھ کس طرح الجھتے ہیں گریبانوں سے

ذوقِ آرائش و تزئین کہاں سے لائیں
لوگ کچھ پھول تو لے آئے گلستانوں سے

اَب جنوں کو کسی زحمت کی ضرورت کیا ہے
سرحدیں مل گئیں ہر شہر کی ویرانوں سے

ایک عالم ہے کہ تاریک ہوا جاتا ہے،
روشنی ہے کہ نکلتی نہیں ایوانوں سے

لوگ پابندِ رہ و رسمِ کہن ہیں ورنہ
ربط کعبے سے دلوں کو نہ صنم خانوں سے

انتہائے فکر کی یہ ہے کہ مٹا جاتا ہے
اک تعلق تھا جو انسان کا انسانوں سے

ان کی تحقیر کسی طور نہ کرنا اے راز
رسم سجدوں کی چلی ہے انہی بت خانوں سے

لہجۂ راز

آرزو طفل تھی جواں بھی ہوئی
دل میں گھٹ کر وبالِ جاں بھی ہوئی

آہ کرتے نہیں کریں بھی تو کیا
نارسا تھی وہ ناتواں بھی ہوئی

زندگی ہے فقط شباب کا نام
کیا ہوا عمرِ جاوداں بھی ہوئی

سرِ محفل نگاہِ شوق کی آنچ
طبعِ نازک پہ کچھ گراں بھی ہوئی

دیکھ کر جن کو اٹھ رہے تھے قدم
ختم وہ گردِ کارواں بھی ہوئی

دیکھ کر گلستاں میں سنّاٹا
رازِ حیرت زدہ خزاں بھی ہوئی

اہلِ راز

پہلے ایماں کا زیاں جاں کا ضرر آخر کار
پیش آیا ہمیں ایسا بھی سفر آخر کار

جذبۂ شوق کوئی لاکھ چھپاتے لیکن
ہو ہی جاتی ہے زمانے کو خبر آخر کار

تازگی روح کو دیتی ہے مگر کیا کیجے
شب میں ڈھل جاتی ہے ہر تازہ سحر آخر کار

جس کی گرمی سے دل وجاں میں توانائی تھی
اسی شعلے نے جلایا مرا گھر آخر کار

رہنمائی کی ضرورت نہیں دیوانوں کو
خود بنا لیتے ہیں وہ راہ گذر آخر کار

مجھ میں رہ کر بھی تعاون نہیں کرتا مجھ سے
کیسے توڑوں میں اس احساس کا سر آخر کار

آ گئے دور مگر راز یہ معلوم نہیں
لے کے جائے گا کہاں ذوقِ سفر آخر کار

لہجۂ راز

لیتے ہیں بصدِ شوق ترا نام بہت سے
مشتاق ہیں آمد کے در و بام بہت سے

تم آئے نہ وہ شام و سحر آئے دوبارہ
آنے کو تو آئے سحر و شام بہت سے

اک سجدہ کی خواہش جو کبھی ہوتی ہے بیدار
ہر سمت نظر آتے ہیں اصنام بہت سے

صد حیف اب اک نام بھی لب پر نہیں آتا
گو ذہن میں رقصاں ہیں ترے نام بہت سے

یوں کشمکشِ دہر سے گذرا ہوں کہ مجھ سے
خود بچ کے گذر جاتے ہیں آلام بہت سے

دس پانچ اگر ہوں تو معافی بھی ہے ممکن
افسوس کہ ہیں رازؔ پہ الزام بہت سے

لہجۂ راز

نہ میرا جرم نہ ان کی عنایتیں نکلیں
خلافِ حسن و وفا چند سازشیں نکلیں

جو دو دلوں میں کبھی پیار کی کرن پھوٹی
تو ہر طرف سے ہزاروں رقابتیں نکلیں

تمیز کر نہ سکے نیک و بد میں ہم کہ یہاں
رفاقتوں میں بھی پنہاں عداوتیں نکلیں

وفا کے نام پہ جن سختیوں سے گزرے ہیں،
خوشا نصیب کہ وہ بھی حماقتیں نکلیں

شہرتیں کہ ہیں وابستہ میرے نام کیساتھ
ضب ہے یہ بھی کسی کی نوازشیں نکلیں

ٹن سی شہر میں محسوس ہونے لگتی ہے
و ذہن سے کبھی صحرا کی وسعتیں نکلیں

سُنا تھا ذکر کبھی ہم نے اک قیامت کا
یہاں تو اور ہزاروں قیامتیں نکلیں

یقیں تو کیا کبھی انسان کو گماں بھی نہ تھا
جو زندگی کی دل آویز صوُرتیں نکلیں

جو دو قدم بھی بڑھے راز سازِ وقت کے ساتھ
تو روکنے کو بہت سی روایتیں نکلیں

لہجۂ راز

ذکر اُن کا میرے غم کی حکایت کے ساتھ ساتھ
حیرت زدہ بھی ہیں وہ ندامت کے ساتھ ساتھ

جس طرح خار و گل کا ہے گلشن میں اشتراک
یوں درد و غم جہاں میں ہیں راحت کے ساتھ ساتھ

آتے رہے ہیں گردِ کدورت لئے ہوئے
غم کے بگولے محملِ عشرت کے ساتھ ساتھ

آئی خزاں تو بلبلِ رنگیں نوا کہاں
رخصت ہوئی وہ پھولوں کی نکہت کے ساتھ ساتھ

ہر چند ہم نگاہ میں لاتے نہیں مگر
کچھ اور غم بھی ہیں غمِ الفت کے ساتھ ساتھ

میرا یہ تجربہ ہے کہ رفتارِ پائے شوق
بڑھتی ہے اور طولِ مسافت کے ساتھ ساتھ

سجدے میں سر ہے سر میں ہے سودائے مکر و فن
دردِ گناہ بھی ہے عبادت کے ساتھ ساتھ

لہجۂ راز

تیرے غم سے اگر فرار کریں
کون سی راہ اختیار کریں

مسکراتے ہیں حالِ غم سُن کر
اور کیا میرے غم گُسار کریں

اپنے حالات سے دوچار ہیں سب
حالِ دل کِس پہ آشکار کریں

جب خِرد اپنا ساتھ چھوڑ گئی
کیا جنوں کا بھی اعتبار کریں

شاخ پر رہ گئے جو مُرجھا کر
آؤ ایسے گلوں سے پیار کریں

جانے معیارِ عشق کیا ہوگا
آپ جب تک وفا شعار کریں

مضمحل ہو کے سو گئے ہیں راز
آپ ٹھہریں کچھ انتظار کریں

لہجۂ راز

اگر غم ہی جوابِ غم نہیں ہے
دلوں میں ربط مستحکم نہیں ہے

نکل جائیگی جاں بیتاب ہو کر
تمہارے گیسُوؤں کا خم نہیں ہے

صراحی جام خم مے خانہ سب ہیں
مگر محفل کا وہ عالم نہیں ہے

احاطہ کر چکیں منزل کا نظریں
مگر یہ فاصلہ بھی کم نہیں ہے

خوشی کا وار بھی سہ جائے گا دل
ترا غم ہے تو کوئی غم نہیں ہے

تیری یادوں کے سائے کے علاوہ
کوئی بھی راز کا محرم نہیں ہے

لہجۂ راز

مجھ سے وہ دور بہت دور بھی ہے تو کیا ہے
چہرہ مہتاب ہے مغرور بھی ہے تو کیا ہے

لب کشا ہوں گے نہ ہم آپ پریشاں کیوں ہیں
دل شکایات سے معمور بھی ہے تو کیا ہے

ظلم کی ہر نئی ایجاد پہ رکھتے ہیں نظر
ظلم سی آپ کا دستور بھی ہے تو کیا ہے

ہر قدم بڑھتا رہے شوق سے منزل کی طرف
سر شکستوں سے اگر چور بھی ہے تو کیا ہے

مشترک ہوگا بہر کیف یہ سرمایۂ عیش
آج یہ دورِ حسیں دُور بھی ہے تو کیا ہے،

کل یہ مجبور ہی مختار زمانہ ہو گا،
آج یہ بیکس و مجبور بھی ہے تو کیا ہے

پوچھتا کون ہے، حق کیا ہے انا لحق کیا ہے
کہنے والا کوئی منصور بھی ہے تو کیا ہے

چین لینے نہیں دے گا کسی پہلو اِے رآز
یہ زمانہ ترا مشکور بھی ہے تو کیا ہے

لہجۂ راز

تیری چاہت میں غمِ دل کے سوا کیا پایا
بن گیا اب یہی غم ایک بڑا سرمایا

کوششیں میں نے بھی کیں ہیں کہ بھلادوں تجھکو
دل سمجھتا نہیں سو بار اسے سمجھایا

شام کے وقت جو دروازے پہ آہٹ بھی ہوئی
دل یہ سمجھا کوئی لیکر تیرا پیغام آیا

میں نے اس پر بھی تری یادوں کا آنچل ڈالا
جب بھی غم کا کوئی بادل میرے سر پر چھایا

میں تو اظہار حقیقت پہ بھی شرمندہ ہوں
وہ غلط بات بھی کہہ کر نہ کبھی شرمایا

شہر کا شہر تھا کس کس کو بتاتے ہم راز
سب نے ہی صورت حالات سے دھوکہ کھایا

لہجۂ راز

خوشی جو آپ کی پیشِ نظر نہیں ہوتی
ہمیں عزیز کبھی زندگی نہیں ہوتی

بھٹک ہی جاتا یقیناً ستارہ محبت میں
جو دل کو آپ سے وابستگی نہیں ہوتی

نظامِ عالمِ ہستی بدل گیا ہوتا
جو ساتھ ساتھ غموں کے خوشی نہیں ہوتی

بدل چکی ہیں مری مسکراہٹیں غم سے
گوارہ اب کوئی دل کو خوشی نہیں ہوتی

جنوں میں جن کے قدم ڈگمگا نہیں جاتے
انہیں نصیب سلامت روی نہیں ہوتی

تھا ان کے ہجر میں لب پہ شکایتوں کا ہجوم
وہ آگئے ہیں تو اب بات ہی نہیں ہوتی

چراغِ دَیر و حرم مدتوں سے ہیں روشن
دلوں سے دُور مگر تیرگی نہیں ہوتی

کشاکشِ غمِ دوراں کے باوجود اے رازؔ
مرے کلام میں افسُردگی نہیں ہوتی

لہجۂ راز

وفورِ درد ہے افراطِ غم ہے
مری تسکین کا ہر ساماں بہم ہے

یہ مانا فاصلہ اب کم سے کم ہے
مگر تشویش دل کو دم بہ دم ہے

پرستش ہو رہی ہے ہر قدم پر
انھیں احساس اس کا ہر قدم ہے

جھکا جاتا ہے خود سر بہرِ سجدہ
یہ مے خانہ ہے یا صحنِ حرم ہے
حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ابھی تک
دلوں میں احترامِ جامِ جم ہے
نہ کچھ عہدِ گذشتہ کی شکایت
نہ ہم کو رازِ مستقبل کا غم ہے

لہجۂ راز

☆

سونا روپ میں ڈھل جاتا ہے
لیکن جلد پگھل جاتا ہے

چال وہ ایسی چل جاتا ہے
سارا کھیل بدل جاتا ہے

سر کو اٹھا کر چلنے والا
آخر منہ کے بل جاتا ہے

بات ہی باقی رہ جاتی ہے
وقت کا تیر نکل جاتا ہے

قافلہ یادوں کا ہر پہر کے
درد کی راہ پہ چل جاتا ہے

دل تو راز چھپانا چاہے
چہرہ رنگ بدل جاتا ہے

لہجہ راز

عقدے بھی ہوا کرتے ہیں ہر دور میں لیکن
ہر دور میں ہوتا ہے کوئی عقدہ کشا بھی

بیٹھے تھے سرِ راہ تو پوچھا نہ کسی نے
دو گام بڑھے ہم تو بڑھا دستِ قضا بھی

آتے رہے طوفان بدلتی رہیں راہیں
بنتے رہے مٹتے رہے نقشِ کفِ پا بھی

رہ جائے گا دب کر وہ پیالوں کی کھنک سے
دیوانوں کی بستی سے اگر شور اٹھا بھی

اے رازؔ یہ ہے ظرف کہ ہم تشنۂ الفت
لب تر نہیں کرتے جو ملے آبِ بقا بھی

ہے ارادہ کبھی جائیں انھیں سمجھانے پھر
وہ اگر دیکھ کے صورت بھی نہ پہچانے پھر

شہر کے قلب میں طوفاں سا بپا رہتا ہے
ہوش میں آگئے شاید ترے دیوانے پھر

دیکھ کر صورتِ حالاتِ صنم خانوں کی
یاد آنے لگے دیوانوں کو ویرانے پھر

منتشر ہوگئے فی الحال مگر کیا غم ہے
روشنی ہوتے ھی آجائیں گے پروانے پھر

راز مشکوک رہیں جن کی وفائیں اکثر
کم بڑھانے لگے اُن لوگوں سے یارانے پھر

لہجۂ راز

اگر ہم اُن سے کبھی غم کی داستاں کہتے
وہ سُن کے اور نہ جانے کہاں کہاں کہتے

اگر نہ ہوتا جہاں میں وجودِ مہر و وفا
تو زندگی کو بھی انساں وبالِ جاں کہتے

گماں بھی ہوتا اگر آپ کی عنایت ہے،
تو دل کی بات ہزاروں کے درمیاں کہتے

قصور اُن کا تھا لیکن بہ فیضِ حُسنِ یقیں
ٹھہرتے مورِدِ الزام ہم جہاں کہتے

وفا کی راہ میں منزل تو کیا ہمیں نہ ملی
وہ موت بھی کہ جسے مرگِ ناگہاں کہتے

ہر ایک چہرے پہ خود اس کا غم نمایاں تھا
تو دشتِ غم میں کسے میرِ کارواں کہتے

اگر جہاں میں کہیں کوئی دوست مل جاتا
تو راز اس سے حکایاتِ دشمناں کہتے

لہجۂ راز

جو بڑھ کے ہاتھ کبھی زلفِ یار تک پہنچے
سکوں کی لہر دلِ بیقرار تک پہنچے

وِداعِ دوست پہ دل نے یہی دعا کی ہے
کہ اس کا حسن کمالِ بہار تک پہنچے

کسی بہانے کسی روز تم جو آجاؤ
تو بیقراریِ دل بھی قرار تک پہنچے

کسی کے لمس سے بھی آشنا ہوتے تھے کبھی
پھر اس کے بعد نہ اس اعتبار تک پہنچے

سفر میں دھوپ کی شدت انہیں کو ہے معلوم
جو لوگ چل کے خزاں سے بہار تک پہنچے

رہِ طلب میں بہت حادثے بھی مگر
قدم قدم صلۂ خوشگوار تک پہنچے

یقین ہے راز محبت اُسی کو کہتے ہیں
دلوں کا رابطہ اک اعتبار تک پہنچے

لہجۂ راز

اگر راہِ محبّت میں یہ پیچ و خم نہیں ہوتے
قدم اہلِ جنوں کے اتنے مستحکم نہیں ہوتے

ترے پیمانِ الطاف و کرم کا شکریہ لیکن
فقط وعدے کسی کے زخم کا مرہم نہیں ہوتے

ترے جور و ستم کی گر حدیں قائم نہیں ہوتیں
ہمارے حوصلے بھی زندگی بھر کم نہیں ہوتے

ہمیں اپنی تباہی کی عبث ان سے شکایت کیا
مقدر میں جو غم ہوتے ہیں بیش و کم نہیں ہوتے

میں اکثر شب کے سناٹے میں پہروں غور کرتا ہوں
ستارے کیوں شریکِ گریۂ شبنم نہیں ہوتے

نہیں ہوتے تری نظروں کے کس تیور میں سو پہلو
ترے جلوے کے کس پہلو میں سو عالم نہیں ہوتے

نہ ہوتا قرب حاصل گر اسے گیسوئے جاناں کا
نسیمِ صبح کے اے رازؔ یہ عالم نہیں ہوتے

لہجۂ راز

نہ روشنی ہے نہ ہموار راستہ اپنا
بھٹک رہا ہے اندھیرے میں قافلہ اپنا

نہ جانے لا کے کہاں رہبروں نے چھوڑ دیا
کہ اور بڑھ گیا منزل سے فاصلہ اپنا

نظر ملاتی نہ اس واسطے حقیقت سے
کہ ٹوٹ جائے گا خوابوں کا سلسلہ اپنا

بدل دیا ہے مری زندگی کا رُخ جس نے
وہ اجنبی تھا جو اب دوست بن گیا اپنا

وہ زندگی میں بڑا کام کیا کرینگے کوئی
کہ جن سے حل نہ ہوا ایک مسئلہ اپنا

مسرّتیں بھی بڑھی ہیں اب آزمانے کو
کبھی رہا تھا غموں سے مقابلہ اپنا

درمیاں اپنے اک حائل ہوئی ایسی دیوار
کوئی چاہے بھی تو برسوں نہیں ہوتی مسمار

وقت جب ضرب رگِ جاں پہ لگا دیتا ہے
تیز کچھ اور بھی ہو جاتی ہے احساس کی دھار

خونِ دل صرف کیا جاتا ہے تب جا کے کہیں
گلشنِ زیست کے اِک گوشے میں آتی ہے بہار

ہے تقاضائے مروّت نہیں کہتا کچھ بھی
کہنا چاہوں تو مرے ذہن میں باتیں ہیں ہزار

رازؔ خود پیکرِ اخلاص و وفا تھے لیکن
ہو گئے پھر بھی وہ اک شخص کی نفرت کا شکار

لہجۂ راز

بہار لائی ہے گلشن میں تازگی آؤ
بڑھے گی اور بھی منظر کی دلکشی آؤ

کسی کو رنگ کی خواہش کسی کو خوشبو کی
ہے انتظار میں گلشن کی ہر کلی آؤ

چلے ہو ترک ملاقات کر کے کس جانب
یہ راہ اور بھی مشکل ہے لوٹ بھی آؤ

میں جانتے ہوئے انجان بن کے دیکھونگا
قریب بن کے کبھی تم بھی اجنبی آؤ

تمہارے لمس نے بھڑکائی تھی جو آخر شب
بجھی نہیں ہے ابھی تک وہ تشنگی آؤ

دوریوں ہو جاؤ گے ہم سے کبھی سوچا نہ تھا
ٹوٹ جائیں گے سب ہی رشتے کبھی سوچا نہ تھا

اپنے گھر سے آپ کے گھر تک پہنچنے کے لئے
بند ہو جائیں گے سب رستے کبھی سوچا نہ تھا

دل میں جو شعلے محبّت کے لپکتے تھے کبھی
راکھ ہو جائیں گے وہ بجھ کے کبھی سوچا نہ تھا

دیکھ کر جن کو نہ اپنی نیند تک اُچٹی کبھی
خواب وہ ہو جائیں گے سچے کبھی سوچا نہ تھا

جن کی قیمت آسماں سے بات کرتی تھی کبھی
اس قدر بک جائیں گے سستے کبھی سوچا نہ تھا

ناچتا تھا دل کبھی جنکے سُروں کی تال پر
بے سرے ہو جائیں گے ایسے کبھی سوچا نہ تھا

میری چاہت کی کہانی من وعن سننے کے بعد
ٹال دینگے آپ یوں ہنس کے کبھی سوچا نہ تھا

آپ کی جس شخصیت کا تھا تصوّر دل میں آز
آپ اس سے مختلف ہونگے کبھی سوچا نہ تھا

لہجۂ راز

گلشنِ زیست میں ہر چیز مکمل تو نہیں
پھول آتے ہیں چنبیلی میں مگر پھل تو نہیں

اسکی لے ٹوٹ ہی جائیگی سن اے مست شباب
چند لمحوں کا ہے یہ گیت مسلسل تو نہیں

رنگ تو شدتِ احساس سے اڑ جاتا ہے
دیکھنا یہ ہے کہ ابرو پہ کوئی بل تو نہیں

گیسوئے زیست کی ہر ایک گرہ کھولیں گے
لاکھ کمزور سہی ہاتھ مگر شل تو نہیں

روک لینے پہ ہے قدرت نہ بہا دینے پر
اشکِ خوں ہے یہ کسی آنکھ کا کاجل تو نہیں

آپ کا شہر بہت دلکش و جاں بخش سہی
دشت میں رہتے ہیں وہ لوگ بھی پاگل تو نہیں

چاند تک وسعتِ تحقیق بھی پہنچی لیکن
یہ بھی انساں کے مسائل کا کوئی حل تو نہیں

بات کرتے رہے ہم راز سے کل پہروں تک
آپ کہتے ہیں کہ پاگل ہے وہ پاگل تو نہیں

لہجۂ راز

جانے کو کہیں جسم مرا چاہے نہ چلا ہے
ہے دل کا تقاضا کہ ابھی وعدہ نبلا ہے

یہ کام کرے یا نہ کرے سوچ رہا ہے
شاید ہیں مرے ذہن کے اندر بھی دوراہے

وہ اپنا کوئی دوست تھا مانو یا نہ مانو
کل شام جو بیہوش پڑا تھا سرِ راہے

کچھ حسن ہی تنہا نہیں چاہت کا طلبگار
خواہش ہے یہ ہر شخص کی کوئی اسے چاہے

آہوں پہ گراہوا ں پہ ہیں پابندیاں عائد
دل سوچ رہا ہے وہ کراہے نہ کراہے

اک گیت لکھوں اس گلِ صحرا کے لئے راز
ایسا مترنم کہ وہ خود آکے سراہے

رہا نہ حوصلہ و عزمِ جان باقی ہے
سفر تمام ہوا اور تھکان باقی ہے

گذر چکے ہیں کڑی آزمائشوں سے مگر
وہ کہہ رہے ہیں ابھی امتحان باقی ہے

تمام زخم ہواؤں نے کر دیئے تحلیل
بس ایک چوٹ کا دل پر نشان باقی ہے

یقیں تو ختم ہوا سخت انتظار کے بعد
جو دل میں تھا کبھی وہم و گمان باقی ہے

مری گرفت کی فی الحال کوششیں نہ کرو
ابھی شکستہ پروں میں اڑان باقی ہے

انھیں بھی توڑ کے رکھ دے نہ تیز و تند ہوا
کہیں کہیں جو کوئی سائبان باقی ہے

چلو نارآز کبھی چل کے اُسکو دیکھ آئیں
سنا ہے گاؤں میں اپنا مکان باقی ہے

لہجۂ راز

دل کو جب ہر ضرب سہہ جانے کی عادت ہوگئی
غم کی وادی میں کچھ اپنی اور شہرت ہوگئی

سازِ دل میں اب کہاں لطف و کرم سوز و گداز
مرکزِ چشم و نظر جب صرف دولت ہوگئی

زندگی اپنی بہت ہنگامہ پرور تھی مگر
رفتہ رفتہ دل کو گھبرانے کی عادت ہوگئی

بے تکلف آ گئے وہ آج ملنے کے لئے
سوچتا ہوں کیا انھیں میری ضرورت ہو گئی

جس کو دیکھا، جسکو چاہا دُور ہی ہوتا گیا
پھر ہوا یوں مجھکو خود اپنے سے نفرت ہو گئی

آپ اپنی چاہ میں ہر شخص ہے ڈوبا ہوا
رازؔ شاید ختم دنیا سے محبّت ہو گئی

لہجۂ راز

بارہا سخت مراحل سے گذر کر آتے
لیکن افسوس کہ تم تک نہ پہنچنے پاتے

آ کے پوچھا نہ کسی نے کبھی کیسے ہیں مزاج
آپ بھی آتے تو آئینہ دکھانے آتے

معترض ہو مرے لہجے پہ تو یہ بھی سوچو
ایک ہی لے میں کوئی گیت کہاں تک گاتے

دھوپ ہی دھوپ ہے اس دشت میں سایہ نہ درخت
ہم یہ سمجھے تھے گذر جائیں گے سائے سائے

طائرِ زیست رہا مثلِ صبا آوارہ
ہم کہیں بیٹھ کے پہلو نہ بدلنے پائے

زیست اک خوف ہے جس سے میں لرزتا ہی رہا
موت پیغامِ سکوں ہے وہ کبھی آ جائے

غمِ ہستی کا مداوا تو ہے ممکن لیکن
ہے دل و جاں کا زیاں کون زباں پر لائے

چاند پیمائی کوئی آخری کوشش تو نہیں
دیکھنا راز یہ انسان کہاں تک جائے

لہجۂ راز

آغازِ سحر ہے نہ ابھی وقتِ سفر ہے
سو جاؤ کہ تاریک ابھی راہ گذر ہے

یہ غم کا سمندر ہے نہ ہو غرقِ تحیّر
قسمت سے کنارا نہ اِدھر تھا نہ اُدھر ہے

دل بجھ گیا لیکن یہ پتہ دیتی ہے گفتار
اس راکھ میں پوشیدہ ابھی کوئی شرر ہے

دن کٹتا ہے کس طرح یہ سورج کو ہے معلوم
شب کیسے گذرتی ہے ستاروں کو خبر ہے

انساں کبھی ڈرتا ہوا چلتا تھا زمیں پر
اب بہرِ سفر چاند ستاروں پہ نظر ہے

سن کر تری روداد یہ محسوس ہوا آز
اک قصہ پارینہ بہ اندازِ دگر ہے

لہجۂ راز

نسیمِ صبحِ نو ہو صبحِ خنداں سے تمہیں کیا ہے
گذر جاؤ کسی چاکِ گریباں سے تمہیں کیا ہے

تمہاری گرمِ رفتاری رہے قائم بہر صورت
چھٹے دامن کسی کے دستِ لرزاں سے تمہیں کیا ہے

میسّر ہیں تمہیں عیش و طرب جو تم نے چاہا تھا
رہیں ثابت کہ ٹوٹیں عہد و پیماں سے تمہیں کیا ہے

سجایا ہے چراغ داغ دل سے غمکدہ ہم نے
مگر ایسے کسی جشن چراغاں سے تمہیں کیا ہے

رہے تا شام اپنے ہم سفر جو دشت و صحرا میں
نظر آئیں اگر شب کو گریزاں سے تمہیں کیا ہے

اُمنڈ کر آ گئے جو اشکِ خوں ضبطِ محبّت سے
کریں گے خشک جا کر کس کے داماں سے تمہیں کیا ہے

گذر جاؤ نہ دیکھو آ زُردیدہ نگاہوں سے
کسی رنگیں قبا محشر بداماں سے تمہیں کیا ہے

لہجۂ راز

جتنا ہم تڑپے رہائی کے لئے
بند کچھ اور بھی کستے ہی رہے

آج ہر چیز گراں ہے لیکن
صرف انساں ہیں جو سستے ہی رہے

ابرِ رحمت رہا لیلاؤں پر
دھوپ میں قیس جھلستے ہی رہے

راز بھی دانا و بینا تھے مگر
اک نہ اک دام میں پھنستے ہی رہے

لہجۂ راز

زندگی کے لئے اسباب مہیّا کرتے
یا کسی حور شمائل کی تمنّا کرتے،

ہم بھی انسان تھے گھبرا ہی گئے آخر کار
اور کب تک کسی تصویر کو دیکھا کرتے

ہم کو چاہا نہ کسی شخص نے اچھّا ہی کیا
ورنہ پھر دن میں بھی ہم خواب ہی دیکھا کرتے

چھوڑنا ساتھ گوارہ تو نہیں تھا لیکن
وقت نے کر دیا مجبور تو ہم کیا کرتے،

ذہن میں ہو گیا بھولی ہوئی یادوں کا ہجوم
میہماں بن کے نہ تم آتے تو اچھّا کرتے

لہجۂ راز

انساں رہِ زیست میں آگے تو بڑھا ہے
لیکن وہ اِس اقدام پہ کچھ کھو بھی چکا ہے

غائب ہوئے کیا جانے کہاں پیار و محبّت
جس شخص کو دیکھو وہ انھیں ڈھونڈ رہا ہے

اِس طرح سے کچھ دیدہ و دل صاف ہوئے ہیں
باقی یہاں غمزہ نہ وہاں مہر و وفا ہے

گھر دیکھیے تو عیش کے ساماں سے مزیّن
احساسِ سکوں ذہن سے کافور ہوا ہے

اصلاً تو کہیں اس کا نشاں بھی نہیں ملتا
کہتے ہیں کہ دل دولتِ ایماں سے بھرا ہے

جب معنئ انسانیت آتے ہیں سمجھ میں
میں بھی نہیں انساں یہی محسوس ہوا ہے

تسلیمِ شکست اس کو نہیں راز، وگرنہ
بازی تو بہت دیر ہوئی ہار چکا ہے

لہجۂ راز

سوز تھے ساز تھے کہ نغمہ تھے
شاخِ گُل تھے کہ چوبِ صحرا تھے

آپ خود ہی قیاس فرمائیں
کیا بتائیں کہ ہم کبھی کیا تھے

تیر بھی کب تلک خطا کرتے
اِک زمانے کا ہم نشانہ تھے

مجھ کو دیکھا رُکے روانہ ہوئے
رازؔ شاید مرے شناسا تھے

لہجۂ راز

جانے کیا بات ہے ہر شرح و بیاں کے باوصف
بُت پرستی بھی ہوئی خوب خدا کے ہوتے،

نارسائی کا یقیں ہوتا ہے دل میں لیکن،
لوگ کرتے ہیں دعائیں بھی دُعا کے ہوتے

غم فزوں تر تھا تو میخانے میں آتے کہ یہاں
کچھ نہ ہوتا تو جنوں خیز دھما کے ہوتے

لہجۂ راز

جو تیرے شہر کے اس پیچ و خم کو دیکھے گا
ضرور ترکِ ملاقات پر بھی سوچے گا

جہاں نگاہِ تصوّر بھی باریاب نہ ہو
قدم قدم کوئی پہنچے تو کیسے پہنچے گا

رواں ہیں خوش نظران درِ صنم قدم بہ قدم
پلٹ پلٹ کے بھلا کون ان کو دیکھے گا

بڑھے چلو کہ یہ جنگل ہے اور یہاں تو ابھی
اندھیرا اور بڑھے گا جو وقت گزرے گا

یہ غم کی دھوپ ہی شاید ترا مقدّر ہے
خوشی کا ابر کہیں اور جا کے برسے گا

غموں کا عکس جبیں پر بھی کچھ نظر آئے
اتر کے دل کے اندھیرے میں کون دیکھے گا

کسی کے پاس نہیں کچھ بھی نفرتوں کے سوا
ہمیں بھی راز کوئی دے تو اور کیا دے گا

لہجۂ راز

کوئی بھی منظر ہستی ہو بدل جاتا ہے
بے وفا وقت دبے پاؤں نکل جاتا ہے

شب ہے تاریک تو کیا خوف کہ شہرِ دل میں
آرزوؤں کا دیا شام سے جل جاتا ہے

کچھ سناؤ بھی حقیقت نہ ہو افسانہ سہی
دل تو دیوانہ ہے باتوں سے بہل جاتا ہے

دل کی بے چینیاں کہتی ہیں ضرور آیئگا
وہ اجالا جو اندھیرے کو نگل جاتا ہے

دل کا خوں ہونے پہ تم اتنا تعجب نہ کرو
آنچ دینے سے تو لوہا بھی پگھل جاتا ہے

دھوپ چمکی ہے یہ چہرے پہ تو ہنگامہ کیا
یہ تو سورج ہے جوانی کا جو ڈھل جاتا ہے

نذرِ اربابِ وفا شوق سے کر دیتے ہیں راز
جذبۂ دل اگر الفاظ میں ڈھل جاتا ہے

لہجۂ راز

نظر سے دور نہ ہو گے کہیں چلے جاؤ
سمٹ رہا ہے زمین و مکاں کا پھیلاؤ

جو فاصلہ ہے اسے آؤ جلد طے کر لیں
کہ آ نہ جائے دل و جسم جاں میں ٹھہراؤ

کوئی نہ آئے گا اَب جاگنے سے کیا حاصِل
گذر رہی ہے دبے پاؤں رات سو جاؤ

رہِ محبّت و نفرت ہیں ساتھ ساتھ رواں
کسی بھی وقت کہیں سے قدم بدل جاؤ

کسی طرح تو یہ لمحاتِ جاں فزا ٹھہریں
جو بات ختم ہوئی ہے اسی کو دُہراؤ

جو تم کو چھوڑ کے تنہا فرار ہو گئے رازؔ
وہ پھر ملیں گے کسی موڑ پہ نہ گھبراؤ

لہجۂ راز

ہے آہ بہ لبِ رازؔ تو حیرت زا نہیں کیوں ہے
لگتی ہے کہیں آگ تو اٹھتا ہے دھواں بھی

لہجۂ راز

ہم بیاں کرتے ہیں رودادِ محبت لیکن
آپ یوں سنتے ہیں جیسے کوئی افسانہ ہو

ہائے یہ دورِ عزیزانِ گرامی ہم سے
اس طرح ملتے ہیں جیسے کوئی بیگانہ ہو

یہ بیاباں ہے انساں کی آواز کہاں
لوٹ کر دیکھئے شائد کوئی دیوانہ ہو

خواہشِ عیش و طرب فطرتِ انساں ہے لئے آز
یہ الگ بات ہے انداز جداگانہ ہو

لہجۂ راز

زخمِ دل پر ہزار آتے ہیں
پھر بھی ہم باوقار آتے ہیں

کچھ تو لمحات خوش گوار آئیں،
حادثے بے شمار آتے ہیں

زخمِ دل مندمل ہوتے شاید
پھر مرے غمگسار آتے ہیں

جب کبھی آتے وہ چمن میں رازؔ
ساتھ لیکر بہار آتے ہیں

لہجۂ راز

نہ دل رہا نہ دل کے تاثرات رہے
مگر حیات کے کچھ تلخ تجربات رہے

اب ان کے مصرف بیجا پہ دل پشیماں ہے
جو چند لمحے کبھی حاصلِ حیات رہے

کیا ہے عشق نے ہر دور میں قبول انہیں
حریم حسن کے جو بھی مطالبات رہے

گلہ نہیں ہے تیری کج ادائیوں کا مجھے
میری حیات میں شامل یہ حادثات رہے

میں خود ہی سنگِ حوادث کے انتظار میں ہوں
کہ نغمہ ریز مرا شیشۂ حیات رہے،

اب اس سے بڑھ کے کوئی اور شے عطا ہو مجھے
نقوشِ غم بھی مرے دل پہ بے ثبات رہے

کسی کے وعدۂ صبر آزما کے شوق میں راز
ہمارے ذہن میں کیا کیا تصورات رہے،

لہجہ راز

ملنے کا جو تم نے کبھی اقرار کیا ہے
ہر لمحہ کو کچھ اور پر اسرار کیا ہے

جب بھی مجھے راحت نے سلایا ہے تھپک کر
بڑھ کر مرے احساس نے بیدار کیا ہے

بے رحم زمانے مجھے جو چاہے سزا دے
میں نے تو دل و جاں سے تجھے پیار کیا ہے

حالات نے ہر لحظہ نئے رنگ بدل کر
ہر سانس کو لذّت کشِ آزار کیا ہے

ہے رحم طلب آج بھی وہ ہاتھ کہ جس نے
تپتے ہوئے صحراؤں کو گلزار کیا ہے

بھاگے تھے خیالات بھی مُنہ پھیر کے مجھ سے
مشکل سے انھیں رازؔ گرفتار کیا ہے

لہجۂ راز

خواب بھی باعثِ تسکین نظر دیکھے ہیں
ہم نے تاریکی میں آثارِ سحر دیکھے ہیں

پھول گلشن کے جنھیں دیکھ کے شرما جائیں
ہم نے صحراؤں میں ایسے گُلِ تر دیکھے ہیں

تذکرہ عام ہے جن کی گہر افشانی کا
ہم نے اِن پھول سے ہونٹوں پہ شرر دیکھے ہیں

ہم تو دیوانے ہیں اے دوست مگر اس در پہ
ہم نے جھکتے ہوتے فرزانوں کے سر دیکھے ہیں

کیوں نہ تنقید کریں اب مرے کردار پہ لوگ
میں نے لوگوں کے بہت عیب و ہنر دیکھے ہیں

اختلافات بھی ہوتے ہیں مگر ہم نے راز
رند و دیندار بہم شیر و شکر دیکھے ہیں

لہجۂ راز

کتنے ناداں تھے ہم راز
پتھر کو بھی ہیرا سمجھے،

لہجۂ راز

تیرے مکاں تک کیسے پہنچا تجھکو کیا معلوم
راہ میں ہم نے کیا کیا دیکھا تجھکو کیا معلوم

پیار کی وادی میں جو اُترا اس کو ہو گا اندازہ
یہ دریا ہے کتنا گہرا تجھکو کیا معلوم

تجھ سے محبّت کا دعویٰ کچھ لوگ یقیناً کرتے ہیں
کون ہے سچا کون ہے جھوٹا تجھکو کیا معلوم

کس نے تیری یاد میں اکثر رات گذاری ہنس ہنس کر
کون پھرا ہے صحرا صحرا تجھ کو کیا معلوم

مذہب کے دیوانے آخر خون کی ہولی کھیل گئے
اس سے آگے کیا کچھ ہوگا تجھ کو کیا معلوم

ٹوٹے شیشے بکھرے آنسو اور سسکتی روحیں آز
شہر وفا میں کیا کیا دیکھا تجھ کو کیا معلوم

راز
لہجۂ

سجدے ہزار کیجئے اس ارضِ پاک پر
سربستہ اس کے سینہ میں ہیں راز قوم کے

کرتا ہے رشک اس کے تقدس پہ عرش بھی
پلتے ہیں اس کی گود میں جانباز قوم کے

لہجۂ راز

اپنی چھوٹی بچی کی اچانک موت پر

تو جہاں ہے ہم وہاں چاہیں تو آ سکتے نہیں
اے رئیسہ ہم تجھے واپس بلا سکتے نہیں
جان دیکر بھی تری ہستی کو پا سکتے نہیں
تیری صورت کو مگر دل سے بھلا سکتے نہیں

تو گئی گھر سے کہ گھر کی روشنی رخصت ہوئی
یاس و حرماں رہ گئے اور زندگی رخصت ہوئی

تیری صورت ہو گئی جب اپنی نظروں سے نہاں
راحت و آرام اپنی زندگی میں اب کہاں
تیرہ و تاریک آنکھوں میں ہوا سارا جہاں
دل میں گھٹ کر رہ گیا ہے تیری یادوں کا دھواں

زندگی کی سب بہاریں ہم سے کوسوں دُور ہوئیں
پھر بھی ہم کچھ اور جینے کے لئے مجبور رہیں

کس قدر خوش ہے وہاں ہم کو سُنا آ کر کبھی
عرش کے سِرِ نہاں ہم کو سُنا آ کر کبھی
کچھ عَدم کی داستاں ہم کو سُنا آ کر کبھی
ہم سے کیوں ہے بدگماں ہم کو سُنا آ کر کبھی

گر مجسّم آ نہیں سکتی تو آ کر خواب میں
کچھ اضافہ کر ہماری حسرتوں کے باب میں

رئیسؔ فروغ

الفتِ بیکراں رئیس فروغ
سوز و سازِ جہاں رئیس فروغ
جانِ ذکرِ بتاں رئیس فروغ
شاعرِ خوش بیاں رئیس فروغ

اس محبت سے اس چمن میں رہے
روح جیسے کسی بدن میں رہے

دھیمی دھیمی سدا رئیس فروغ
قولِ صدق و صفا رئیس فروغ
شانِ اہلِ وفا رئیس فروغ
مہکی مہکی فضا رئیس فروغ

آج سوئے جناں روانہ ہوئے
کل حقیقت تھے اب فسانہ ہوئے

نہ رہے وہ، تو کوئی کچھ بھی کہے
عمر بھر وہ بہت اُداس رہے
سینکڑوں زخم کھائے رنج سہے
پھر بھی دنیا میں سربلند رہے

تذکرہ اب بھی عام ہے اُن کا
زندہ تابندہ نام ہے اُن کا

کوئی نغمہ ہے اب، نہ کوئی ساز
آرہی ہے مگر مجھے آواز،
اے مِرے دوست اے مِرے دمساز
سچ تھا مجھ کو تِری وفا پر ناز

اب بھی ہے پیار کا وہی انداز
تو محبّت کا دیوتا ہے لہ آذ

لہجۂ راز

خوشاب میں آمد

سرزمینِ پاک پر آیا تھا میں بے نیلِ مرام
پاس مِرے کوئی کنگھا تھا نہ آئینہ تھا

مرحلہ سخت تھا لیکن نہ میں جھجکا نہ رُکا
کوئی دیتا بھی سہارا مجھے منظور نہ تھا

کام سے کام تھا لب پر کوئی نعرہ تھا نہ شور
قتل کر دیتا مجھے کوئی میں منصور نہ تھا

روک دیتیں مجھے موجوں کا یہ مقدور نہ تھا
آگیا جلد کنارا بھی بہت دور نہ تھا

مشکلیں جتنی پڑیں کاٹ دیں سب لب بستہ
دوست سب دور تھے اغیار سے کچھ کہہ نہ سکا

دل گرفتہ تھا مگر عزمِ جواں رکھتا تھا
تیز حالات کے دھارے پہ بھی میں بہہ نہ سکا

پھر میں حالات کا انداز جفا سہ نہ سکا
اور مجبور و سراسیمہ یہاں رہ نہ سکا

کی نہ فریاد کبھی لاکھ سہے غم میں نے
آخرش آ گئی منزل تو لیا دم میں نے

اب اگر ٹوٹ گیا دم تو مجھے کیا غم ہے
زیر تو کر لیا حالات کا رستم میں نے

لہجۂ راز

جب غمِ دنیا سے جاں چھوٹی تو پھر یہ غم ہوا،
چھوڑ کر ہم کو ہمارے دوست رخصت ہو گئے

جن کے دم سے تازگی ماضی کے افسانوں میں تھی
ایک ایک کر کے وہ سارے دوست رخصت ہو گئے

پہلے ساجد اور ظفر رخصت ہوئے پھر اعتماد
ہائے کیسے پیارے پیارے دوست رخصت ہو گئے

زندگی کی دھوپ میں تپتے ہوئے دن ڈھل گیا
چاند جب تک سر ابھارے دوست رخصت ہوگئے

بچ کے طوفاں سے سلامت سب نکل آئے مگر
آکے دریا کے کنارے دوست رخصت ہوگئے

راز کیا تھا وقتِ رخصت بات تک منہ سے نہ کی
دور سے کرکے اشارے دوست رخصت ہوگئے

خوشاب میں دوبارہ ورود
پندرہ سال بعد

مجھ کو پہنچا دیا پھر گردشِ دوراں نے وہاں
ہر شجر غم سے سلگتا نظر آتا تھا جہاں

اس زمیں پر کبھی آباد تھا میرا بھی جہاں
ثبت اِس پر ہیں ابھی تک مرے قدموں کے نشاں

دل سے اٹھتا چلا آتا ہے دھواں کیا کیجے
یوں اُبھر آتی ہیں یادیں کہ بیاں کیا کیجے

ان فضاؤں میں ہے ابتک مری آہوں کا دھواں
یہیں آئی تھی مرے باغِ جوانی پہ خزاں

چوٹ جو کھائی تھی دل پر وُہ اُبھر آئی ہے
لوٹ آنے کی یہاں خوب سزا پائی ہے

ہے یہ بہتر کہ کراچی کو رَوانہ ہو جاؤں
اور اس شہر کے ہنگاموں میں جا کر کھو جاؤں

ورنہ رک کر یہاں کچھ اور تماشا دیکھوں
اپنے ماضی کا تڑپتا ہوا لاشا دیکھوں

آہ احساس کی شدّت سے جلا جاتا ہوں
کل تو کل ہے میں اسی وقت چلا جاتا ہوں

فیضؔ کی یاد میں

جلو میں شعر و سخن ندرتِ خیال گئے
دیارِ یار سے جب فیضِ خوش مقال گئے

خبر نہیں کہ وہ کب اپنے شہر میں آئے
سُنا تو صرف یہی کل وہ خوش خصال گئے

وہ آفتاب تھے علم و ادب کی دنیا کے
انہیں زوال نہ آیا وہ لازوال گئے

کمالِ فن بھی وہیں ان کے ساتھ ساتھ گیا
بقدرِ ظرفِ جہاں بھی وہ باکمال گئے

وہ ایک راہ تھے اور ایسے خضرِ راہ بھی تھے
کہ ایک نسل کو سانچے میں اپنے ڈھال گئے

غریبِ شہر کبھی اپنے گھر بھی لوٹے گے
کہا کسی نے تو ہنس کے وہ بات ٹال گئے

مسافرت کا جہاں درج تھا فسانۂ درد
کتابِ وقت سے وہ سب ورق نکال گئے

ہُوا وصال جو اس کشتۂ محبّت کا
تو آکے قبر پہ وہ چند پھول ڈال گئے

اگر کھلا درِ زنداں تو شہر شہر پھرے
اِسی سفر میں شب و روز ماہ و سال گئے

جو زخم چہرۂ انسانیت پر آئے نظر
وہ کر کے انکا بھی اے آزا ندماں گئے

مختصرات

○ راز زیدی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، جنہوں نے غزل کے نئے مطالبات کو بھی سمجھا ہے اور قدیم روایات کو بھی اپنایا ہے۔ راز گوشہ نشین شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کو پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

راز صاحب کی شاعری کا ایک اہم پہلو اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ اپنی اخلاقی تعلیم میں شعریت کو فنا نہیں ہونے دیتے۔

جو آئیں راہ میں پتھر انہیں ہٹاتے چلو　　　بچو گے تم تو کوئی اور چوٹ کھائے گا

ہوائے نفرت و اغراض اتنی تیز نہ ہو　　　کہ لو چراغِ محبت کی تھرتھرانے لگے

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

دہلی یونیورسٹی

○ ہم ایک متلاطم باطنی کیفیت کے دور سے گذر رہے ہیں اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارے بعض غزل گو شعراء اس روحانی ہیجان کی ترجمانی بڑی قادر البیانی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ میں راز زیدی کا شمار انہیں غزل گو شعراء میں کرتا ہوں۔

رئیس امروہوی

○ راز زیدی کے اشعار میں دل گداختگی کے ساتھ ساتھ آپ کو زندگی کے بھرپور تجربے محسوس ہوں گے، اور یہی راز زیدی کے کلام کی خصوصیت ہے۔ وہ مضمون آفرینی کے لئے گداز اور سوز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی شاعری میں بڑی اور اچھی شاعری کے تمام عناصر جستہ جستہ پائے جاتے ہیں اور یہ فی زمانہ بڑی خوبی کی بات ہے

تابش دہلوی

○ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حضرتِ راز کو زبان و بیان پر قدرتِ کامل حاصل ہے۔ غزل جیسی لطیف و نازک ترین صنفِ سخن کے جملہ مطالبات کو انہوں نے پورا کیا ہے۔ مشاہدہ عمیق اور مطالعہ شعر و ادب وسیع ہے جس کے بغیر ایسی اچھی غزلوں کا وجود میں آنا ممکن ہی نہیں تھا۔

راغب مرادآبادی